اردو نثر کی داستان

قسط ۶

ہر ماہ کی یکم تاریخ کو

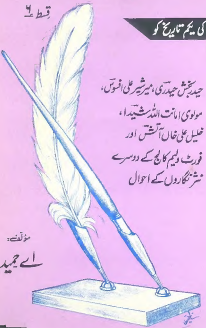

حیدر بخش حیدری، میر شیر علی افسوس،
مولوی امانت اللہ شیدا،
خلیل علی خاں آشک اور
فورٹ ولیم کالج کے دوسرے
نثر نگاروں کے احوال

مؤلف:
اے حمید

۶
روشن کتابیں

مطبوعات شیخ غلام علی، ادبی مارکیٹ، چوک انار کلی، لاہور

دُنیا کی ہر قومی اور علاقائی
زبان کی روشن کتابوں کا انتخاب

نگران : شیخ نیاز احمد
مُدیرِ مسئول : ارشد نیاز
مُدیر : رب نواز ملک

مجلسِ مشاورت :
اے حمید - ایم - ایس ناز
محمد حنیف شاہد - عینکاف خالد

آرٹ : سلیم اختر

طابع : شیخ نیاز احمد
مطبع : غلام علی پبلشرز، لاہور

ادارہ :
مطبوعات شیخ غلام علی
اَدبی مارکیٹ، چوک انارکلی، لاہور
فون نمبر :
۵۲۹۰۸ ۶۱۸۵۹ ۲۱۳۰۲۰

تار :
کتاب مین (KITABMAN) لاہور

اُردو نثر کی داستان کے بارے میں

اے حمید کے اَدبی سلسلے 'اُردو نثر کی داستان' کے بارے میں ہمیں قارئین کے حوصلہ افزا خطوط موصول ہو رہے ہیں۔ ہمارے بعض کرم فرماؤں نے اس اَدبی سلسلے میں اس قدر زیادہ دلچسپی کا اظہار کیا ہے کہ چند اغلاط اور واقعات کی تکرار کی نشاندہی کر کے ہماری راہنمائی بھی فرمائی ہے۔ جناب اے حمید ایسے تمام اصحاب کا شکریہ ادا کرتے ہیں جنھوں نے قیمتی مشورے دے کر ایک صحیح سمت متعین کرنے میں اُن کی مدد کی۔

بعض اصحاب نے صفحات کی کمی کا شکوہ کیا ہے۔ ان کا یہ شکوہ بالکل بجا ہے۔ لیکن اس میں مشکل یہ ہے کہ بعض اوقات موضوع اس قدر طویل ہوتا ہے کہ ہمارے مقرر کردہ صفحات سے بھی آگے بڑھ جاتا ہے۔ لیکن بعض موضوعات اتنے مختصر ہوتے ہیں کہ تیس بتیس صفحات تک بھی رسائی حاصل نہیں کر سکتے۔ چنانچہ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ مختصر موضوعات کو کھینچ کر لمبا کرنے یا طویل موضوعات کو سکیڑنے سے بہتر یہ ہے کہ اس اَدبی سلسلے کی قیمت میں مزید کمی کر دی جائے۔ آئندہ سے آپ کو یہ اَدبی سلسلہ ضخامت کی کمی بیشی کے اعتبار سے مناسب قیمت میں ملے گا — ہمارے اس فیصلے کی روشنی میں قارئین بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں کہ ہم تاجرانہ نقطۂ نظر سے ہٹ کر صرف اور صرف قارئین کے اَدبی ذوق کا بھلا چاہتے ہیں۔ ہم نے قیمت میں کمی کر کے قارئین پر کوئی احسان نہیں کیا بلکہ اپنا فرض پُورا کیا ہے — اور فرض کی ادائیگی کا مرحلہ بڑا پُرمسرت مرحلہ ہُوا کرتا ہے۔

قارئین! 'اُردو نثر کی داستان' قسط ۸ میں ہم نے حیدر بخش حیدری کی 'توتا کہانی' کا مفصل جائزہ لیا تھا اور طالبانِ ادب کو مکمل اور جامع معلومات بہم پہنچانے کے لیے پوری داستان کی تلخیص پیش کی تھی۔ زیرِ نظر قسط میں آرائشِ محفل کی بقیہ کہانیوں اور حیدر بخش حیدری کی چند دوسری تصانیف کے علاوہ فورٹ ولیم کالج کے مشہور نثر نگاروں کے احوال بھی بیان کیے گئے ہیں۔ اِن نثر نگاروں میں میر شیر علی افسوس، مولوی امانت اللہ شیدا، خلیل علی خاں اشک کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

'اُردو نثر کی داستان' کے ساتھ ہی آج ہم حضرت داتا گنج بخشؒ کی سیرت اور حالاتِ زندگی پر مبنی ایک اہم کتاب بھی آپ کی نذر کر رہے ہیں۔

دس فروری کی روشن کتابیں ٹائیٹل کے آخری صفحے پر ملاحظہ فرمائیں۔

نیاز احمد

بائیسویں کہانی

جب آفتاب چھپا۔ اور ماہتاب نکلا۔ خجستہ رخصت لینے توتے کے پاس گئی۔ اور متفکر ہو کر بیٹھی۔ توتے نے اسے حیران دیکھ کر کہا۔ اے کد بانو! آج کی رات کیوں اس قدر متفکر ہے!

تجھے دیکھنا یوں گوارا نہیں
اس اندوہ کا مجھ کو یارا نہیں

نہ لیبی! خدا کے لیے کسی چیز کا غم نہ کھا۔ اور کچھ اندیشہ اپنے جی پر نہ لا۔

یہ تیری جوانی یہ کچھ تجھ پہ غم
ستم ہے۔ ستم ہے۔ ستم ہے ستم

جب خجستہ نے یہ مضمون توتے کی زبان سے سنا۔ تب اسی ڈھب کے شعر پڑھے۔

کیا کہوں کچھ کہا نہیں جاتا
چپ رہوں چپ رہا نہیں جاتا
بے ملے اس کے بن نہیں پڑتی
اور ملوں تو ملا نہیں جاتا

پھر کہنے لگی اے توتے! میں رات سے اسی فکر میں ہوں کہ معشوق میرا دانا ہے۔ یا ناداں۔ یا عالم ہے یا جاہل۔ اگر چترا ہے۔ تو اس سے دوستی کرنا بہتر ہے۔ اور اگر وہ مورکھ ہے۔ تو اس سے دور ہی رہنا اچھا۔ کیونکہ بے وقوف سے دوستی کرنا ایسا ہے۔ کہ جیسا کوئی اپنے جی سے دشمنی کرے۔ بلکہ بن آئی ہی مرے۔ توتے نے کہا۔ اے خجستہ اس وقت تو جا۔ اور یہ نقل سوداگر کی بیٹی کے گم ہونے کی اس سے کہہ۔ عقل مندی اور ہوشیاری اس کی اس سے آزما۔ اگر تیرے سوال کا جواب اچھا دے۔ تو دانا جانیو۔ نہیں تو ناداں سمجھو۔
خجستہ نے پوچھا۔ وہ حکایت کیوں کر ہے، کہہ۔

توتا کہنے لگا۔ کہ کابل میں ایک سوداگر نہایت مالدار تھا۔ اور اس کی زہرہ نام ایک بیٹی بہت خوبصورت تھی۔ تمام شہر کے عمدہ اس کی آرزو رکھتے تھے۔ پر وہ کسو کو قبول نہ کرتی۔ اور اپنے باپ کو یہی کہتی تھی۔ کہ میں اس شخص سے شادی کروں گی۔ جو دانش مند کامل ہو۔ یا ہنرمند بے بدل۔

اس بات کا شہرہ ہر ایک شہر میں پہنچا۔ غرض کسی ملک میں تین جوان تھے کہ وے اپنے برابر کوئی ہنرمند و ہوشیار اس زمانے میں نہ رکھتے تھے۔ وے تینوں کابل میں جا کر اس سوداگر سے کہنے لگے۔ اے شخص! اگر تیری لڑکی شوہر ہنرمند چاہتی ہے۔ تو ہم تینوں آدمی حاضر ہیں۔ کہ

● —— بالفعل اس جہاں میں ہمارے برابر ہنرمند اور کوئی نہیں۔ وُہ نہیں (دوھیں) ان میں سے ایک نے کہا۔ میں یہ ہنر رکھتا ہوں۔ کہ جو چیز گم ہو۔ اسے بتا دیتا ہوں۔ اور جس جگہ ہو۔ ٹھکانہ لگا دیتا ہوں۔ دوسرے نے کہا۔ میں کاٹ (کاٹھ) کا گھوڑا ایسا بناؤں کہ حضرت سلیمانؑ کے تخت سے بھی آگے اڑاؤں۔ تیسرے نے کہا میں وہ تیر انداز ہوں۔ جو تیرے تیر کا پھل کھا دے۔ سو کھیت چھوڑ باہر نہ جا دے۔

یہ سخن سن کر وہ تاجر اپنی بیٹی کے پاس گیا۔ اور کہنے لگا۔ بابا! آج تین شخص ایسے ہنرمند آئے ہیں۔ اب کیا کہتی ہے۔ اس نے ان کی تعریف سن کر کہا۔

بابا جان! میں اپنے جی میں سوچ کر کل اس بات کا جواب دوں گی اور ان میں سے ہر ایک کو قبول کروں گی۔ یہ بات کہہ کر آپ رات کے وقت گم ہو گئی۔ صبح کو اس کے باپ نے ہر چند ڈھونڈا۔ کہیں نہ پایا۔ خدا جانے کہاں گئی، صبح کو سوداگر اس شخص کے پاس گیا۔ جو احوال گم ہونے کا جانتا تھا۔ اور پوچھا۔ سچ کہہ۔ میری لڑکی یہاں سے کہاں گئی؟ اور کہاں ہے؟ اس نے یہ بات سنتے ہی تامل کیا۔ اور بعد ایک گھڑی کے کہا۔ کہ اس کو ایک پری فلانے پہاڑ پر لے گئی ہے۔ کہ وہاں نہ کوئی جا سکتا ہے۔ نہ کوئی اس کی خبر لا سکتا ہے۔

تب اس سوداگر نے دوسرے سے کہا۔ کہ تو کاٹھ کا گھوڑا بنا کر اس تیسرے جوان تیر انداز کو دے۔ کہ وہ اس گھوڑے پر سوار ہو کر جاوے۔ اور اس پری کو تیر سے مار کر میری لڑکی کو اپنے پیچھے چڑھا کر لے آوے۔

آخر کار اس نے کاٹھ کا گھوڑا بنا کر اس تیر انداز کو دیا۔ اور وہ اس گھوڑے پر سوار ہو کر اس پہاڑ پر گیا۔ اور ایک ہی تیر سے اس پری کو مار کر اسے لے آیا۔ پھر وہ تینوں جوان اس لڑکی پر عاشق ہو کر آپس میں قضیہ کرنے لگے۔ اور ہر ایک یہی چاہتا تھا۔ کہ میں ہی اپنی شادی اس کے ساتھ کروں۔

توتے نے یہ سخن جس گھڑی یہاں تک پہنچایا۔ خجستہ سے کہا۔ یہ حکایت اپنے معشوق سے پوچھ۔ کہ وہ لڑکی ان تینوں میں سے کس کو دینی بہتر ہے اور وہ کسے پہنچتی ہے۔ اگر جواب باصواب دیوے۔ تو جانیو کہ ہوشیار ہے اور نہیں۔ تو نالائق و نابکار۔

خجستہ نے کہا۔ اے توتے! پہلے تو ہی کہہ دے۔ کہ وہ کسے پہنچتی ہے۔ بھلا میں بھی دریافت کر رکھوں۔ توتے نے کہا۔ اس شخص کو جو پری کو مار کر اسے لے آیا۔ کیونکہ ان دونوں نے ہنر دکھایا تھا اور وہ اپنے جی پر کھیلا تھا جو ایسے خوف کے مکان پر گیا۔ اور اس کو لے آیا۔ توتے نے یہ کہانی تمام کر کے کہا۔ اے خجستہ! اب جا اور اس سے مل۔

کہاں پھر یہ موسم جوانی کہاں
غنیمت سمجھ صحبت دوستاں

خجستہ نے یہ سنتے ہی چاہا کہ وہ جاوے۔ اور اس گل رو کو گلے لگا دے اتنے میں صبح ہو گئی۔ مرغ نے بانگ دی۔ جانا اس کا اس روز بھی موقوف ہوا۔ تب یہ دوہا پڑھا۔ اور رونے لگی۔

نینن اندر آؤ تو پلک ڈھانپ میں لوں
نا میں دیکھوں۔ اور کو نا تجھے دیکھن دوں

تیئسویں کہانی

جب آفتاب چھپا اور ماہتاب نکلا۔ تب خجستہ رخصت لینے توتے کے پاس گئی۔ اور کہنے لگی۔ کہ اے عقلمند! بھلی بات کی نصیحت کرنے والے۔ و اے وفادار حرمت کے رکھنے والے! بہتر یہی ہے۔ کہ آج مجھے جلد رخصت کر۔

ساقی خبر شتاب لے میرے خمار کی
طاقت نہیں رہی ہے مجھے انتظار کی

اور نہیں تو صاف صاف جواب دے کہ صبر کر کے بیٹھ رہوں۔ اور یہ فرد پڑھا کروں۔

بلبلو جاؤ۔ تمہیں گل کے گلے سے لگیو
دست صیاد سے گلشن کو تو رو بیٹھی ہیں

توتا کہنے لگا۔ کہ اے خجستہ! میں تجھے ہر ایک شب رخصت کرتا ہوں پر نہیں جانتا کہ نصیب تیرے کیسے ہیں۔ جو تجھ سے یاری نہیں کرتے۔ بہتر یہی ہے۔ کہ آج شتاب اپنے معشوق کے پاس جا۔ اور اس سے ملاقات کر۔ لیکن یہ نصیحت میری یاد رکھیو۔ کہ جو کام کرنا۔ سو ایسا کرنا جس کے سبب سے کسی آفت میں نہ پڑے۔ بلکہ کچھ فائدہ اٹھاوے۔ جس طرح سے ایک برہمن راے بابل کی بیٹی پہ عاشق ہوا۔ اور ایک تدبیر سے معشوق مع مال و اسباب اس کے ہاتھ لگا۔ اور کسی آفت میں نہ پھنسا۔

شرط سلیقہ ہے ہر ایک امر میں
عیب بھی کرنے کو ہنر چاہیے

خجستہ نے پوچھا۔ کہ وہ حکایت کیوں کر ہے، بیان کر۔

توتا کہنے لگا۔ کسی وقت میں ایک برہمن خوب صورت و عقلمند گردش فلکی سے اپنے شہر کو چھوڑ کر راے بابل کے ملک میں گیا اور ایک دن کسی باغ میں جا کر سیر گل و غنچے کی کرنے لگا۔ قضا کار راے بابل کی بیٹی بھی اسی چمنستان میں بہار لالہ و نسترن کی دیکھتی پھرتی تھی۔ اتفاقاً نظر اس برہمن کی اس مہ جبیں پر پڑی۔ اور اس لڑکی کی بھی آنکھ اس برہمن مہر طلعت کی آنکھ سے لڑی۔ جوانی کی امنگ نے اپنی قوت دکھلائی اور شعلۂ عشق نے آتش محبت دونوں طرف بھڑکائی۔ حاصل کلام یہ ہے۔

ہوئے دونوں وے عشق کے دست گیر
مقید وہ اس کا وہ اس کی اسیر

بعد دو چار گھڑی کے وے دونوں اپنے گھر آن کر۔ وہ دیوانی ہوئی اور یہ بیمار پڑا۔ آخر وہ برہمن ایک جادوگر کے پاس جا کر اس کے قدم پر گر پڑا۔ اور یہ قطعہ پڑھنے لگا۔

رنج کھینچے ہیں۔ داغ کھائے ہیں
دل نے صدمے بڑے اٹھائے ہیں
اب قدم آپ کے نہ چھوڑوں گا
بڑی محنت سے میں نے پائے ہیں

اس جادوگر کی یہاں تک خدمت کی۔ کہ وہ اس کی جانفشانی دیکھ کر شرمندہ ہوا۔ اور ایک دن مہربان ہو کر پوچھنے لگا۔ اے غریب آشفتہ طبیعت! تو آزمائش چاہتا ہے۔ یا کچھ کام دنیوی رکھتا ہے؟ جو کچھ درکار ہو۔ اس کا انجام یہ فقیر کر دے۔ برہمن نے یہ سخن سن کر اس جادوگر کے سامنے ہاتھ باندھ کر احوال اپنا بہ خوبی تمام ظاہر کیا۔ جب اس نے کہا۔ کہ خیر۔ میں جانتا تھا۔ کہ مجھ سے کان زر چاہے گا۔ یا کچھ ایسا کام کہے گا۔ کہ وہ مجھ سے بھی نہ ہو سکے گا۔ اور آدمی سے آدمی کو ملانا بڑی بات ہے۔

یہ کہہ کر اس گھڑی ایک مہرہ حکمت کا بنا کر اس برہمن کو دیا۔ اور کہنے لگا کہ یہ مہرہ اگر مرد اپنے منہ میں رکھے۔ تو عورت معلوم ہووے اور اگر عورت رکھے۔ تو مرد کی شکل پیدا کرے۔ یہ کہہ کر ایک دن وہ جادوگر اسی برہمن کی شکل ہو۔ اور اس برہمن کو برہمنی کی صورت بنا کر راے بابل کے پاس جا کر کہنے لگا۔ کہ مہاراج کی جے ہو۔ میں برہمن ہوں میرا لڑکا دیوانہ ہو کر کہیں چلا گیا۔ یہ اس کی جورو ہے۔ اگر اس کو اپنے گھر میں دو چار دن کے واسطے جگہ دو گے۔ تو میں اس عرصہ میں اپنے لڑکے کو ڈھونڈ نکالوں گا۔ راے بابل نے یہ بات اس کی قبول کی۔ اس برہمن کو اپنے گھر میں جگہ رہنے کو دی۔ اور اس برہمن جادوگر کو کچھ خرچ راہ دلوا کر رخصت کیا۔ پھر اس برہمن کو اپنے پاس رکھا۔

کیوں دیکھا؟ کس حکمت سے اس جادوگر نے برہمن کو اس کی آشنا کے پاس پہنچایا۔ اور آپ بھی کچھ روپے لے کر اپنے گھر گیا۔

غرض وہ لڑکی برہمن کو بہت پیار کرنے لگی۔ تب ایک دن اس نے پوچھا۔ کہ رنگ تیرا دن بدن زرد ہوا جاتا ہے۔ اور آنکھوں میں آٹھوں پہر آنسو ہی بھرا رہتا ہے۔ بیماروں کا سا حال بنایا ہے۔ سچ کہہ۔ کیا کسی پر دل لگایا ہے؟ اس لڑکی نے چاہا۔ کہ احوال اپنا اس سے چھپاوے۔ یہ برہمن نے اس سے چالاکی کر کے کہا۔ کہ میں جانتا ہوں۔ کہ تو کسی پر عاشق ہے۔ اگر راز اپنا تو مجھ سے کہے گی۔ تو کارسازی تیری کر دوں گی۔ تب اس لڑکی نے تمام حقیقت اپنی مو بہ مو اس طور سے کہہ سنائی کہ میں ایک برہمن بچے پر مرتی ہوں اور اسی کے غم میں اپنی جوانی کے دن بھرتی ہوں۔ وہ برہمن جو برہمنی کے بھیس میں تھا۔ کہنے لگا۔ کہ سچ کہہ۔ اگر تو اس برہمن کو دیکھے۔ تو پہچانے؟ اس نے کہا۔ البتہ اگر اس کو دیکھوں گی۔ تو پہچانوں گی۔

اس نے وہ مہرہ اپنے منہ سے اگل دیا۔ وہیں پھر اپنی اصلی صورت پر آ گیا۔ اور اس نے اسے پہچان کر خوب سا گلے لگا لیا۔ اور ایک عجیب طرح کا چین اٹھایا۔

بعد کتنے دنوں کے آپس میں مشورت کر کے کہنے لگے۔ کہ اب یہاں کا رہنا اچھا نہیں۔ بلکہ بہتر یہ ہے۔ کہ اس ملک سے نکلیے۔ اور کسی شہر میں چل کر بے کھٹکے رہیے۔ یہ ٹھیرا کر راے بابل کی بیٹی بہت سا زر و جواہر اپنے باپ کے خزانے سے لے کر برہمن کے ساتھ آدھی رات کو اپنے گھر سے باہر نکلی۔ اور کسی ملک کی راہ لی۔ اور کئی دن کسی بادشاہ کے شہر میں جا کر داخل ہوئے۔ اور ایک مکان سر بازار اچھا سا بنا کر رہنے لگے۔ اور تمنا اپنے دل کی بے دھڑک ہو کر نکالتے۔ اور اگر کبھی اختلاط کے وقت شعر خوانی پر جی چلتا تو ہر ایک یہ قطعہ پڑھتا۔

صبح تو جام سے گزرتی ہے
شب دل آرام سے گزرتی ہے
عاقبت کی خبر خدا جانے
اب تو آرام سے گزرتی ہے

جب اس لڑکی کے باپ نے ان دونوں کو وہاں نہ دیکھا۔ نہایت فکرمند ہوا۔ اور ہر چند ڈھونڈا۔ سراغ بھی نہ ملا۔ کیونکہ وہ اس کے ملک سے نکل کر کسی اور سرحد میں گئے تھے۔

توتے نے یہ کہانی کہہ کر کہا۔ بی بی! اب جلدی سدھارو۔ اور حسرتیں

دل کی اس سے مل کر نکالو۔ کم بانو نے سنتے ہی چاہا۔ کہ جاوے اور لذت زندگانی کی اس سے اٹھاوے۔ اتنے میں صبح ہو گئی۔ اور مرغ نے بانگ دی۔ جانا اس کا اس روز بھی موقوف ہوا۔ تب یہ بیت پڑھی اور رونے لگی

چھوٹ جاویں غم سے ہر دم کے جو نکلے دم کہیں
خاک ایسی زندگی جو تم کہیں اور ہم کہیں

چوبیسویں داستان

جب سورج چھپا اور چاند نکلا۔ خجستہ رخصت لینے توتے کے پاس گئی۔ اور کہنے لگی۔ میں یہی چاہتی ہوں۔ کہ اپنے معشوق کے پاس جاؤں۔ اور پہلے اس کی عقلمندی دریافت کروں۔ اگر عقلمند پاؤں گی۔ تو دوستی کروں گی اور نہیں تو باز رہوں گی۔ اور صبر کروں گی کس واسطے کہ شعور مندوں نے کہا ہے۔ تا مقدور تین شخصوں سے آشنائی نہ کیا چاہیئے۔

اول عورتوں کی دوستی کا۔

دوسرے لڑکوں کے اخلاص کا۔

تیسرے احمقوں کے ساتھ کا۔

مشہور ہے۔ دانا کی دشمنی ناداں کی دوستی سے بہتر ہے۔

توتے نے کہا۔ کہ اے بی بی! جو تو کہتی ہے۔ سو سچ کہتی ہے۔ بہتر ہے کہ اس رات ایک حکایت اپنے دوست کے سامنے بیان کرے اور اس سے پوچھے۔ اگر جواب ایسا دے۔ کہ جو پسندیدہ ہو۔ تو اسے عاقل و ہوشیار سمجھو۔ اور اچھا نہ دے۔ تو ناداں جانیو۔

خجستہ نے پوچھا۔ وہ نقل کون سی ہے؟ جو اس سے پوچھوں؟

توتا کہنے لگا۔ کہ کسی وقت میں رائے بابل کا بیٹا ایک بت خانے میں پوجا کرنے گیا۔ اور وہاں ایک لڑکی کو دیکھا۔ کہ وہ نہایت خوبصورت ہے کہ بیان نہیں کیا جاتا۔ عجب حسن اسے خدا نے دیا تھا۔ سبحان اللہ۔ چودھویں رات کا چاند اس کے مکھڑے سے شرمائے۔ اور سیاہی اس کی زلف کی رات کو آٹھ آٹھ آنسو رلائے۔ قد اس کا اگر سرو دیکھے تو مارے خجالت کے زمین میں گڑ جائے اور کبک کب اس کی رفتار کے انداز سے کو پائے۔

غضب جوڑے کی بندش ہے۔ قیامت قد بالا ہے
ستم چتون۔ پری مکھڑا۔ بدن سانچے میں ڈھالا ہے

وہیں اس پر عاشق ہوا۔ اور دل نے بے قراری کی۔ تو گھبرا کر اس بت کے پاؤں پہ سر جھکا کر گر پڑا۔ اور یہ دعا عاجزی سے مانگنے لگا۔ کہ اگر لڑکی میرے ساتھ بیاہی جائے۔ تو سر اپنے تن سے جدا کروں۔ اور تمہارے قدم پر چڑھاؤں۔

آخر کار یہ کہہ کر اپنے گھر گیا۔ اور اس کے باپ کو اس نے یہ پیغام بھیجا کہ مجھے اپنی غلامی میں لیجیے۔ اور لڑکی اپنی مجھے بیاہ دیجیے۔

جس گھڑی یہ پیغام اس کے باپ نے سنا۔ اسی گھڑی اپنی لڑکی کا بیاہ اور گونا اس کے ساتھ موافق اپنی رسموں کے کر دیا۔

پھر وہ بطور دونوں عاشق و معشوق کے رہنے لگے آپس میں مل کر۔ کبھی یہ اپنے گھر اس کے ساتھ چین کرتی۔ اور کبھی وہ اپنے مکان پر اس کے ساتھ آرام کرتا۔ اسی طرح سے ایک مہینہ گزرا۔ اتفاقاً وہ لڑکی اپنے سسرال میں تھی کہ اس کے ماں باپ نے اسے اور اس کے دولہا کو اپنے گھر بلوایا۔ اور وہ لڑکا اپنی دلھن کو ساتھ لیے ہوئے چلا۔ اور ایک برہمن بھی قدیم اس کے مصاحبوں میں تھا۔ وہ بھی اس کے ساتھ پیچھے پیچھے ہو لیا۔

جس وقت وہ لڑکا اس بت خانے کے پاس پہنچا۔ جس میں اس نے اس لڑکی کو دیکھا تھا۔ پہچانا۔ اور وہ اقرار جو کیا تھا۔ سو یاد آیا۔ اور اپنا وعدہ وفا کرنے کو بت خانے میں تنہا گیا۔ اور سر کاٹ کر اس بت کے پاؤں پر دھر دیا۔

نام پر اپنے مرد جاتے ہیں
عیش کھوتے ہیں جی گنواتے ہیں

بعد ایک دم کے وہ برہمن جو اس بت خانے میں گیا۔ تو کیا دیکھتا ہے کہ رائے بابل کا لڑکا موا (مرا) پڑا ہے۔ اس کے تن سے سر بھی جدا ہو رہا ہے۔ یہ ماجرا دیکھ کر وہ ڈرا۔ اور جی میں کہنے لگا۔ کہ میں اگر اب یہاں سے جیتا جاؤں گا۔ تو لوگ یہی معلوم کریں گے۔ کہ یہ لڑکا اس جگہ اسی نے مارا ہے۔ کیونکہ اب تک اس مقام پہ سوائے اس کے اور کوئی نہیں آیا۔

غرض اس نے بہت سا اندیشہ اپنے دل میں کر کے کہا۔ بہتر یہی ہے کہ میں بھی اپنا سر تن سے اتار دوں۔ اور اس بت کے قدم پر چڑھاؤں یہ کہہ کر اس نے بھی اپنا سر اتارا۔ اور اس بت کے قدم پر گر پڑا۔

بعد ایک گھڑی کے وہ لڑکی بھی جو اس بت خانے میں گئی۔ تو ان دونوں کو موا (مرا) ہوا دیکھ کر متعجب ہوئی۔ اور کہنے لگی۔ کہ ہے ہے! دونوں تو سر کٹے لہو لہان پڑے ہیں۔ یہ کیا غضب ہوا۔ یہ کہہ کر چاہتی تھی کہ اپنا سر کاٹے یا شوہر کی لاش گلے سے لگا کر ستی ہو جائے۔ اتنے میں اس ڈیوڑھی سے آواز آئی۔ اے لڑکی! یہ سر کٹے ہوئے تو ان کے تنوں سے ملا دے۔ رام کی کرپا سے یہ دونوں ابھی جی اٹھتے ہیں۔

یہ سنتے ہی وہ خوش ہوئی۔ جلدی سے اپنے شوہر کا سر برہمن کے تن پہ اور برہمن کا سر اپنے شوہر کے تن پر رکھ دیا۔ دونوں جی اٹھے۔ اور اس عورت کے آگے کھڑے ہو گئے۔ رائے بابل کے بیٹے کے سر سے اور اس برہمن کے تن سے قضیہ ہونے لگا۔ سر بولا۔ کہ یہ میری جورو ہے۔ اور تن نے کہا۔ یہ میرا قبیلہ ہے۔

توتے نے یہ حکایت تمام کر کے خجستہ سے کہا۔ اگر عقل اس کی آزمایا چاہتی ہے تو یہی بات اس سے پوچھ۔ کہ وہ عورت سر کو پہچانتی ہے۔ یا تن کو؟

خجستہ نے کہا۔ اے توتے! پہلے تو ہی کہہ۔ کہ مستحق اس کا کون ہے!

توتا بولا۔ کہ ذی حق اس کا سر ہے۔ کس واسطے۔ کہ سر عقل کی جگہ ہے اور بدن کا سردار۔

خجستہ نے جو یہ قصہ توتے کی زبان سے سنا۔ قصد اپنے یار کے پاس

جانے کا۔ اتنے میں صبح ہوئی۔ اور مرغ نے بانگ دی۔ جانا اس کا اس روز بھی موقوف ہوا۔ تب یہ فرد پڑھی۔ اور رونے لگی۔

وصل کی شب یہ اے صباح فراق
روز تو روز بھی تصدق ہے

پچیسویں کہانی

جب سورج چھپا اور چاند نکلا۔ خجستہ رخصت لینے توتے کے پاس گئی۔ اور کہنے لگی۔ اے توتے! میں اسی بات سے ڈرتی ہوں۔ اور شرمندہ ہوئی جاتی ہوں۔ کہ جب اس سے ملوں۔ اور وہ دیر ہونے کا غصہ مجھ پر کرے۔ تو میں نہیں جانتی۔ کہ تب کون سا بہانہ کروں!!

توتے نے کہا۔ اے کدبانو! کچھ اندیشہ نہ کر۔ کس واسطے کہ عورتیں بہت سی باتیں بنا جانتی ہیں۔ اور کیسے کیسے فریب کرتی ہیں۔ کیا کیا مکر یاد رکھتی ہیں۔ اور بہت حاضر جواب ہوتی ہیں۔ میں نے ان کی زبان سے بہت عذر سنے ہیں۔ اور پسند کیے ہیں۔ تو ایسی بھولی بھالی۔ کہ کچھ نہیں جانتی۔ کیا خوب! مثل مشہور ہے۔

چہ تدبیر عورت اگر اپنے آئے
تو ہاتھی کو پیڑھی کے نیچے چھپائے
کف دست پر کب نکلتے ہیں بال
وہ چاہے تو اس پر بھی سرسوں جمائے

ایسے ایسے سخن کی فکر کرتی ہے۔ کہو خبر ہے۔ دم بھر ٹھیر۔ دل سنبھال جی کو ڈھارس دے۔ ذرا سے توقف کر۔ کہ ایک عورت نے جو حیلہ و عیاری اپنے شوہر کے ساتھ کی تھی۔ وہ بھی تجھے سنا دوں۔

خجستہ نے پوچھا۔ کہ اس کی نقل کیوں کر ہے؟ بیان کر۔

توتا کہنے لگا۔ کہ کسی وقت ایک شخص نے اپنے قبیلے کو کئی ایک پیسے شکر لانے کو دیئے۔ اور وہ شکر لانے بازار میں ایک بنیئے کی دکان پر گئی۔ بنیا اسے دیکھتے ہی عاشق ہوا۔ پھر اس عورت نے سیر بھر شکر مول لے کر اپنی چادر کے کونے میں باندھی۔ اتنے میں وہ بنیا اس سے لگاوٹ کرنے لگا۔ اور باتیں خوش طبعی کی۔ وہ بھی راضی ہو گئی۔ بعد اس راز و نیاز کے وہ اس عورت کو اپنے گھر میں لے گیا۔ اور وہ اپنی چادر گرہ باندھی ہوئی بنیئے کی دکان پر رکھ کے اس کے ساتھ چلی گئی۔ تب اس بنیئے کی گماشتے نے اپنی چالاکی سے اتنے عرصہ میں جھٹ پٹ شکر اس کے کونے سے کھولی اور اتنی ریت اس کی جگہ باندھ دی۔

اتنے میں وہ رنڈی اس کی دکان سے نکلی۔ اور جھٹ پٹ چادر اٹھا اپنے گھر کی طرف راہی ہوئی۔ اور اپنے خاوند کے آگے بے دھڑک چلی گئی۔ اور وہ پوٹلی اس نے آگے دھر دی۔ اس نے گرہ کھول کر جو دیکھا تو شکر کے بدلے ریت نظر آئی۔ حیران ہو کر کہنے لگا۔ کہ یہ کیا مسخرہ پن ہے۔ جو تو مجھ سے کرتی ہے۔ میں نے شکر کو بھیجا تھا۔ تو ریت لائی۔ اس نے یہ بات سنتے ہی بے تامل کہا۔

اگر یوں ہی شکر میں لاتی رہوں گی
تو اک دن میں جی ہی سے جاتی رہوں گی

تب اس مرد نے گھبرا کر پوچھا۔ بی بی! یہ کیا سبب ہے۔ جو کچھ آج تو بدحواس معلوم ہوتی ہے۔

شکر کی جگہ ریت لائی ہے کیوں؟
یہ رونی سی صورت بنائی ہے کیوں؟

تب اس نے مسکرا کر کہا۔ کہ اجی کیا کہوں! جس وقت میں گھر سے باہر نکلی۔ اس وقت میرے پیچھے ایک بیل ڈکارتا ہوا دوڑا۔ اس کے ڈر سے میں بھاگی۔ اسی صدمے سے میں گری۔ اور پیسے بھی میرے ہاتھ سے گر پڑے لوگوں کی شرم سے ڈھونڈ نہ سکی۔ یہ ریت اٹھا کر لے آئی ہوں۔ پیسے اس میں ہوں گے۔ تم نکال لو۔ اور میں نہایت تھکی ماندی ہوں۔ کہو تو ذرا سے سو رہوں؟

یہ بات سنتے ہی اس کے خاوند نے اس کو گلے لگایا۔ اور چھیاں لے کر کہا۔ اگر پیسے گر پڑے تھے۔ تو بلا سے گر پڑے تھے۔ تم ریت کیوں اٹھا لائی؟

حاصل کلام۔ اس عورت نے ایسا بے تامل اپنے خاوند کو جواب دیا کہ مطلق وہ اس پر خفا نہ ہوا۔ بلکہ اور مہربانی کرنے لگا۔

توتے نے جب یہ کہانی تمام کی۔ خجستہ سے کہا۔ یہ کون سی بڑی بات ہے۔ تو اس سے بھی زیادہ کر سکتی ہے۔ کچھ خطرہ نہیں۔ اے بی بی! اب شتاب جا۔ اور اپنے معشوق کو گلے لگا۔ اگر وہ تجھ پر غصہ کرے گا۔ تو البتہ اس وقت تجھے جواب معقول سوجھے گا۔

اس شیریں سخنی سے توتے کی خجستہ کو تسلی ہوئی۔ بمفرق کفش جم چھماتی پاؤں میں ڈال کر چاہتی تھی۔ کہ اٹھے۔ اتنے میں مرغ بولا۔ اور صبح ہوئی۔ جانا اس کا اس روز بھی موقوف ہوا۔ تب یہ بیت پڑھی اور رونے لگی۔

کون سی شب کو ہوگا وصل نگار
ہر سحر ہے ہماری دشمن کار

چھبیسویں کہانی

جب آفتاب چھپا اور مہتاب نکلا۔ خجستہ شرمندوں کی سی صورت بنائے ہوئے توتے کے پاس گئی۔ اور کہنے لگی۔ اے محرم راز میرے۔ میں واری تیرے! عقلمندوں نے کہا ہے۔ کہ جس عورت کو شرم نہیں ہوتی۔ وہ کسی قوم میں حرمت نہیں رکھتی۔ اور وہ عورت مستورات میں بد ہے۔ اب یہی چاہتی ہوں کہ صبر کروں۔ اور اپنے گھر میں بیٹھی رہوں۔ کسی غیر مرد سے آشنائی نہ کروں۔ اور نہ کسی کے گھر جاؤں۔

گھر سے نکلوں غیر کی میں جستجو کے واسطے
لوگ جی دیتے ہیں اپنا آبرو کے واسطے

توتا کہنے لگا۔ اے خجستہ! حق تو یہ ہے۔ کہ تجھ سی عورت عقلمند ہوشیار آج تک نہیں دیکھی۔ اور جو تو کہتی ہے۔ سچ کہتی ہے۔

نینا وہی سراہیے جن نین میں لاج
بری چھبی ادر مکھ بھری سواد یں کونے کاج

لیکن ڈر یہ ہے۔ اگر صبر کرے گی۔ تو جان تیری بھی اس بادشاہ کی

طرح نکل جائے گی۔ خجستہ نے پوچھا۔ کہ اس کی نقل کیوں کر ہے! بیان کر۔ توتا کہنے لگا۔ کسی شہر میں ایک سوداگر نہایت مال دار اور صاحب وقار تھا۔ اور بہت سے گھوڑے ہاتھی اپنے پاس رکھتا تھا۔ اور اس کی بیٹی بہت خوبصورت اور حسین تھی۔

وہ نقشہ جسے دیکھ مہ داغ کھائے
وہ صورت کہ تصویر کو حیرت آئے

اور شہرہ اس کی خوب صورتی کا ہر ایک ملک میں پہنچا تھا۔ اور ہر ایک شخص کا دیدہ نہ دیدہ اس کے دیکھنے کا تھا۔ اور ہر ایک یہی چاہتا تھا۔ کہ اپنی شادی اس کے ساتھ کرے۔ لیکن باپ اس کا مارے غرور کے کسی کو قبول نہ کرتا تھا۔ اس عرصہ میں عہدِ شباب اس کا قریب پہنچا اور نخلِ جوانی ثمرِ کامرانی سے پھیلنے لگا۔

کچھ کچھ جوبن ابھرا۔ تب اس کے باپ نے اسی ملک کے بادشاہ کی خدمت میں جا کر اس مضمون کی عرضی گزرانی کہ یہ غلام ایک ایسی حسین لڑکی گویا رکھتا ہے۔ کہ گفتگو اس کی رشک بلبل ہزار ہے۔ اور چال اس کی غیرت کبک کوہسار۔ جانور اس کی باتیں سننے کے واسطے ہوا پر سے اترتے ہیں۔ اور مست بے ہوش ہوتے ہیں۔ جس جس نے اس کے سخن کو سنا ہے۔ اُس اُس نے غش کیا ہے۔ امیدوار ہے۔ کہ وہ لڑکی حضور میں قبول ہو۔ اور خدمت میں کنیزوں کی طرح مشغول کر لائق حضور ہے۔ تو یہ خدمی اپنی ہم قوم میں اور بھی زندگی پیدا کرے۔ اور قدر اس کی زیادہ ہو۔

بادشاہ نے جو یہ عرضی ملاحظہ کی۔ تو خوش و خرم ہوا۔ اور اپنے دل میں کہنے لگا۔ جو کوئی نصیب اچھے رکھتا ہے۔ تو ہر ایک چیز خود اس کے پاس آ رہتی ہے۔

یہ کہہ کر اپنے چار وزیروں کو اشارہ کیا۔ کہ تم اس تاجر کے گھر جاؤ اور اس کی بیٹی کو دیکھو۔ احوال کما حقہ دریافت کرو۔ اگر وہ قابل حضور عالی ہو۔ تو جلدی آ کر خبر کرو۔

غرض وہ چاروں وزیر بادشاہ کے فرمانے کے بہ موجب اس سوداگر کے گھر گئے۔ اور اس لڑکی کی صورت دیکھتے ہی غش ہوئے اور آپس میں مشورت کر کے کہنے لگے۔ اگر اس صاحبِ حسن کو بادشاہ دیکھے گا۔ تو دیوانہ ہو جائے گا۔ رات دن اسی کے پاس رہے گا۔ ملک کی طرف متوجہ نہ ہوگا۔ پس ہر ایک کام تباہ ہووے گا۔ اور ملک کے بندوبست میں خلل پڑے گا۔ بہتر یہی ہے کہ اس کی تعریف اس کے سامنے نہ کیجیے اور اس لڑکی کے لینے کی صلاح بادشاہ کو نہ دیجیے۔

یہ بات انہوں نے آپنے جی میں ٹھہرا کر بادشاہ سے جا کر عرض کی کہ خداوندا! اس کی خوبصورتی کی خبر حضور میں جو پہنچی تھی۔ سو غلط۔ اس سے بہتر بہتر لونڈیاں محل مبارک میں بہت سی ہیں۔ بادشاہ نے یہ سن کر کہا۔ کہ خیر۔ اگر وہ ایسی ہی ہے۔ جو تم کہتے ہو تو میری بھی مرضی نہیں۔ کہ اس کے ساتھ شادی کروں۔ اور آپنے اوپر خواہ نخواہ کا عذاب لوں۔ آخر بادشاہ نے اس سوداگر بچی کو قبول نہ کیا۔ اور وہ سوداگر جب وہاں سے مایوس ہو کر پھرا۔ تب اس شہر کے کوتوال سے اس کی شادی کر دی۔

ایک دن اس لڑکی نے آپنے دل میں کہا۔ کہ میں اس قدر خوبصورت و حسین ہوں۔ تعجب ہے۔ کہ مجھے بادشاہ نے پسند نہ کیا۔ انشاءاللہ ایک دن آپنے تئیں اسے دکھلاؤں گی۔

القصہ ایک دن وہ بادشاہ اس کوتوال کی حویلی کی طرف سے کسی باغ کی سیر کو جاتا تھا۔ کہ جلدی جلدی وہ لڑکی کوٹھے پر چڑھ گئی اور بادشاہ کو اپنے حسن کا جلوہ دکھایا۔ دیکھتے ہی وہ عاشق ہو گیا۔ اور وزیروں کی طرف غضب کی نگاہ کر کے یہ فرد پڑھی اور کہنے لگا۔

دشمنی میں بھی یہ نہیں کرتے
دوستی میں جو تم نے دکھلایا

یہ کیا سبب تھا۔ جو تم نے مجھ سے جھوٹ کہا۔ تب انہوں نے عرض کی کہ خداوندا! اس وقت ان گناہ گاروں نے یوں مشورت کی تھی۔ کہ اگر بادشاہ ایسی عورت صاحبِ جمال دیکھے گا۔ تو اس کے عشق میں ملک کے کاروبار سے غافل ہو جائے گا۔ سلطنت خاک میں ملے گی۔ اور رعیت تباہ ہووے گی۔ بادشاہ کو یہ بات ان کی پسند آئی اور خطا ان کی معاف کی۔ مثل مشہور ہے۔

باتیں ہاتھی پائے اور باتیں ہاتھی پاؤں۔

آخر اس کے عشق میں بیمار پڑا۔ اور یہ قطعہ پڑھنے لگا۔

یہی پیغام درد کا کہنا
گر کوئی کوئے یار میں گزرے
کون سی رات آن ملیئے گا
دن بہت انتظار میں گزرے

تب وزیروں نے معلوم کیا۔ کہ یہ کوئی دن میں جان سے جاتا ہے۔ عرض کی کہ کوتوال سے اس عورت کو لے لو۔ اور شربت وصال نوش جان فرماؤ۔ اگر وہ اس کے بھیجنے پر راضی ہو۔ تو بہتر۔ نہیں تو بہ زور چھین لو۔ بادشاہ نے کہا۔

میں اس ملک کا بادشاہ ہوں۔ ہرگز ایسا کام نہ کروں گا کیونکہ یہ بات بادشاہوں کے انصاف سے دور ہے۔ اور بادشاہوں کو لازم نہیں۔ جو اس قدر ظلم و ستم نوکروں اور رعیتوں پر کریں۔ یا آپنی قوت انہیں دکھلائیں یہ سراسر ناانصافی ہے۔ سوا اس کے جو ظلم کرتا ہے۔ سو آپ بھی خراب ہوتا ہے۔

جو کہ ظالم ہے وہ ہرگز پھولتا پھلتا نہیں
سبز ہوتے کھیت دیکھا ہے کہیں شمشیر کا؟

بالفعل اس بیت پر عمل کرتا ہوں۔

جی گنوانا سہل ہے آگے مرے
پر نہ دوں گا عدل آپنے ہاتھ سے

آخر کار بادشاہ کی اس غم میں یہ حالت پہنچی۔ کہ تمام ہو گیا۔ توتے نے جب کہانی تمام کی۔ خجستہ سے کہا۔ کہ صبر کرنا تیرے حق میں

اچھا نہیں سنے اگر تو بھی صبر کرے گی۔ تو اس بادشاہ کی طرح سے ایک دن مر جائے گی۔ کچھ حاصل نہ ہوگا۔ جس سے بہتر یہی ہے۔ کہ اب جا اور اس سے ملاقات کر۔

خوشی سے مئے وصل کو نوش کر
غم دین و دنیا فراموش کر

خجستہ نے یہ سن کر چاہا۔ کہ آپنے تئیں اس کے پاس پہنچاوے اتنے میں صبح ہو گئی۔ اور مرغ نے بانگ دی۔ جانا اس کا اس روز بھی موقوف ہوا۔ تب یہ بیت پڑھی۔ اور رونے لگی۔

دن یہ کیسا فلک دکھاتا ہے
شب امید سے چھڑاتا ہے

ستائیسویں کہانی

جب سورج چھپا اور چاند نکلا۔ خجستہ آہ و زاری کرتی ہوئی۔ آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے دل پُر درد سے توتے کے پاس رخصت لینے گئی۔ اور کہنے لگی۔

اے توتے! میں نے سنا ہے۔ کہ ایک غریب اعرابی نے کسی دولتمند سے جاکر کہا۔ کہ میں کعبے جاتا ہوں۔ اس نے کہا۔ بہت بہتر۔ دیر نہ کیجئے۔ بلکہ جلد سدھاریئے۔ اس نے کہا۔ میں کچھ خرچ راہ نہیں رکھتا۔

دولت مند نے کہا۔ اگر تیرے پاس خرچ نہیں ہے۔ تو مت جا۔ میں کتاب کی رو سے کہتا ہوں۔ کہ جو مفلس ہو۔ اسے طواف کعبہ فرض نہیں کہ خواہ نہ خواہ آپنے اوپر عذاب اٹھاوے۔ اور دھکے کھاوے۔ خدا نے محتاج کو نہیں کہا۔ کہ تو دھکے کھا۔ اعرابی نے کہا۔ میں تیرے پاس کچھ زر مانگنے آیا ہوں۔ مسئلہ پوچھنے نہیں آیا۔ جو تو کتاب کی رو سے باتیں بناتا ہے۔ اے توتے! میں تجھ سے ہر شب صرف رخصت لینے آتی ہوں تو بے فائدہ ادھر ادھر کی گپ شپ ہانکا کرتا ہے۔ نصیحت سننے تو نہیں آتی۔ انہیں باتوں سے میں تجھ پر بھی خفا ہوں گی۔ جب توتا ڈرا۔ کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ مجھے بھی اس مینا کی طرح مار ڈالے۔ یہ سمجھ کر وہ خوشامدیوں کی طرح باتیں کرنے لگا۔ اور یہ شعر پڑھا۔

عجب نصیب اور ہماری قسمت خفا جو ہم سے تو بے سبب ہے
یہ کیا غضب ہے۔ جو تو غضب ہے۔ تیرا غضب تو بڑا غضب ہے

اور کہنے لگا۔ اے خجستہ! میری نصیحت سے دل تنگ نہ ہو۔ اور برا مت مان۔ کس واسطے جو کوئی کسی کی اچھی بات قبول کرتا ہے۔ وہ بات دونوں جہان میں کام آتی ہے۔ کہ بانو کہنے لگی۔ اے توتے! جو تو کہتا ہے۔ سو میں سب سنتی ہوں۔ لیکن آج کی شب نہایت تاریک ہے اور میں اکیلے جاتی ڈرتی ہوں۔ اگر تو کہے تو آپنے غلام کو ساتھ لے کر جاؤں۔ اور یار امیدوار سے ملوں۔

توتا یہ سنتے ہی آپنے پروں سے چھاتی پیٹ کر کہنے لگا۔ ہے ہے خدا کے واسطے ایسا نہ کرنا۔ خبردار آپنے غلام کو ساتھ لے کر نہ جانا۔

عقلمندوں نے کہا ہے۔ کہ کمینہ ہرگز وفا نہیں کرتا۔ اور یہ قوم کم ظرف ہوتی ہے۔ تو نے شاید احوال اس کمہار کا نہیں سنا۔ جو ایسی باتیں نادانی کی کرتی ہے۔ خجستہ نے پوچھا۔ اس کی حکایت کیوں کر ہے؟ بیان کر۔

توتا کہنے لگا۔ کہ ایک کمہار نے کسی دن بہت سی شراب پی۔ اور بدمست ہوا۔ کوزے اور قرابے مٹی کے اور جو باسن شراب کے تھے۔ ان پر گرا۔ اور لوٹا۔ وے ٹوٹے۔ یہ تمام زخمی ہوا۔ مدت میں وہ زخم اچھے ہوئے۔ مگر نشان ان زخموں کے اس طرح معلوم ہوتے تھے۔ کہ شاید یہ زخم تیر اور تلوار کے ہیں۔ اتفاقاً اس شہر میں کال پڑا۔ وہ وہاں سے نکل کر اور شہر میں گیا۔ اور نوکری تلاش کرنے لگا۔ اس شہر کے بادشاہ نے جو اس کے جسم پر اس طرح کے زخم دیکھے۔ تو معلوم کیا۔ کہ یہ بڑا ہی سپاہی ہے۔ جو اس قدر زخم بدن پر اٹھائے ہیں۔

یہ سمجھ کر بادشاہ نے اسے نوکر رکھا۔ اور مرتبہ اس کا زیادہ کیا۔ اور آپنے دل میں کہا۔ کہ یہ بڑا سورما ہے۔ جو اس کا بدن ایسا زخموں سے چور ہے۔ بعد کئی دن کے ایک غنیم اس بادشاہ پر چڑھا۔ اور گاؤں اطراف کے لوٹے۔ بادشاہ نے اسے آپنی فوج کا سردار کر کے چاہا۔ کہ وہ دشمن سے لڑنے کو بھیجے۔ یہ احوال دریافت کر کے وہ ڈرا۔ اور بیمار پڑا حضور اعلیٰ میں ہاتھ باندھ کر عرض کی۔ کہ خداوندا! میں ذات کا کمہار ہوں۔ مجھ سے لڑائی کا سرانجام نہ ہو سکے گا۔ مثل مشہور ہے۔ تیلی کیا جانے مُشک کا بھاؤ۔

یہ سنتے ہی بادشاہ ہنسا۔ اور آپنے دل میں شرمندہ ہوا۔ اور کسی سردار کو اس غنیم پر بھیجا۔

توتے نے یہ کہانی تمام کر کے خجستہ سے کہا۔ کہ غلام کو اپنے ساتھ مت لے جا۔ اس سے کام بھلائی کا نہ ہوگا۔ بلکہ اور رسوا کرے گا۔ جاتی ہے تو اکیلی جا۔ خجستہ نے یہ سنتے ہی چاہا۔ کہ اکیلے آپنے تئیں اس کے پاس پہنچاوے۔ اور حظ زندگانی کا اٹھائیے۔ کہ اتنے میں صبح ہوئی۔ اور مرغ نے بانگ دی۔ جانا اس کا اس روز بھی موقوف ہوا۔ تب یہ شعر پڑھا۔ اور رونے لگی۔

روز و شب ہجر کی یکساں ہے۔ چلے جاتے ہیں
نہ ہمیں صبح سے مطلب۔ نہ ہمیں شام سے کام

اٹھائیسویں کہانی

جب سورج چھپا اور چاند نکلا۔ خجستہ مردانہ لباس پہن ہتھیار لگا۔ لٹ پٹی پگڑی باندھ توتے کے پاس رخصت لینے گئی۔ اور اس نے جو اسے اس بانکپن سے دیکھا تو بے اختیار ہنسا۔ اور کہنے لگا۔

اے خجستہ! مرحبا! خوب کیا۔ کہ ایسی اندھیاری رات میں مردانہ لباس پہن کر تنہا آ گئی۔ اور غلام کو ساتھ نہیں لائی۔ کیا ہی اچھا کام کیا۔ سبحان اللہ بی بی۔ تیری ماں تجھی کو جنی۔ حق تو یہ ہے۔ کہ میں تیری ہوشیاری کے صدقے۔ کس واسطے کہ ایک توتا آج میرے قدیم دوستوں سے اڑا جاتا تھا۔ مجھے اس قید خانے میں دیکھ کر اوپر سے نیچے اترا۔ اور میرے پاس آن کر بیٹھا۔ یہ نقل میں نے اسی سے سنی ہے۔ اور یہ حکایت بھی اسی طرح کی ہے۔ جو شب کو میں نے تجھ سے کہی تھی۔ سو تو نے بھی اس کے بموجب کیا۔ یقین ہے کہ اب کہیں خطا نہ پاوے گی۔ خجستہ نے پوچھا کہ وہ نقل کیوں کر ہے؟ بیان کر۔

توتا کہنے لگا۔ کسی وقت ایک شیر مع شیرنی دو بچوں سمیت کسی جنگل میں رہا کرتا تھا۔ اتفاقاً ایک دن مارے بھوک کے بوکھلایا۔ اور اس صحرا میں شکار ڈھونڈنے لگا۔ حق تو یہ ہے۔ کہ مشقت بہت اٹھائی۔ اور محنت بہت سی کی۔ تب بہ لاچاری اپنے گھر کی طرف پھرا۔ کہ ناگاہ رستے میں اس نے دیکھا۔ کہ ایک بچہ ننھا سا گیدڑ کا آنکھیں بند کیے دو چار دن کا پڑا ہے اور بلبلاتا ہے۔ تب یہ اپنے جی میں خوش ہوا۔ اور اس کو وہاں سے اٹھا کر اپنی مادہ کے پاس لے آیا۔ اور کہنے لگا۔ کہ میں نر ہوں۔ اگر دو چار دن اور بھی نہ کھاؤں گا۔ تو رہ سکتا ہوں۔ اور کچھ نہ ہوگا۔ اور تو مادہ ہے اگر آج تو فاقہ کرے گی تو شام ہی تک مر جاوے گی۔ اس واسطے اس بچے کو لے آیا ہوں۔ تو اسے کھا اور اپنے بچے کو دودھ پلا۔ اس نے کہا کہ نر کو یوں ہی چاہیئے۔ لیکن میں دو بچے ننھے ننھے اپنے آگے رکھتی ہوں بھلا کس طرح سے اسے کھاؤں۔ اور انہیں دودھ پلاؤں؟

کوکھ کو مت کسی کی آتش دو
اپنی چھاتی پہ ہاتھ دھر دیکھو

اور سوائے اس کے کہ تم نر ہو۔ اور دل سخت رکھتے ہو۔ تم تو کھا ہی نہیں سکتے۔ میں مادہ نرم دل ہوں۔ کیوں کر کھاؤں؟ اگر کہو تو اس یتیم کو بھی اپنے بچوں کی طرح سے پالوں۔ شیر نے کہا۔ بہتر۔ آخر شیرنی نے اس یتیم بچے کو بھی اپنے بچے کے ساتھ پالا۔

بعد کتنے دنوں کے وے تینوں بڑے ہو گئے۔ اور وے بچے شیر کے اس کو اپنا بڑا بھائی جانتے تھے۔ اور بھائیوں کی طرح آپس میں کھیلا کرتے تھے۔ اور اس جنگل میں موافق اپنی اپنی قوت کے شکار کیا کرتے اتفاقاً ایک دن وے کسی طرف گئے۔ اور شکار کی تلاش کرنے لگے ناگاہ ایک ہاتھی کسی سمت سے انہیں نظر آیا۔ وے دونوں بچے شیر کے بے اختیار اس پر جھپٹے۔ اور وہ مارے ڈر کے پچھلے ہی پاؤں ہٹا اور بھاگا۔ پھر کسی درخت سے نلے جا کر چھپ رہا۔ شیر کے بچوں نے جوں اپنے بڑے بھائی کو بھاگتے دیکھا۔ آپ بھی بھاگے۔ بعد ایک دم کے آپس میں مل کر گھر میں آئے۔ اور ماں سے وہاں کا ماجرا کہنے لگے۔ یہ بات سن کر ہنسی اور کہنے لگی۔

بیٹا! یہ گیدڑ کا بچہ ہے۔ بہادری کب کر سکتا ہے۔ اور ہاتھی کے سامنے کب جا سکتا ہے؟

زاغ کب پہنچے ہے بیٹا کبک کی رفتار کو
بے تمہارے کون مارے پیل بد خونخوار کو

توتے نے یہ کہانی تمام کر کے خجستہ سے کہا۔ کہ اب اٹھ۔ اپنے معشوق کے پاس جا۔ کہ اس سے مل کر حظ زندگانی کا اٹھا۔ کہ بانو نے یہ سنتے ہی چاہا کہ جاوے۔ اور اپنے جانی کو گلے لگا دے۔ اتنے میں صبح صادق ہو گئی مرغ نے بانگ دی۔ جانا اس کا اس روز بھی یوں ہی رہا۔ تب یہ بیت پڑھی اور رونے لگی۔

صبح نت کرتا ہے۔ یہ دل اشکباری بیشتر
ہو سحر کو خانۂ ماتم میں زاری بیشتر

اٹھتیسویں کہانی

جب سورج چھپا اور چاند نکلا۔ خجستہ چاک گریبان۔ حال پریشان آنکھوں میں آنسو بھرے۔ سر کھلے توتے کے پاس رخصت لینے گئی۔ اور کہنے لگی۔

اے یار وفادار! اے محرم راز دل افگار!
آتش عشق سے جلے ہے دل
آہ! یہ آگ کس نے بھڑکائی ہے

اے توتے! اب تو میرا دل اس کی جدائی کی آگ سے جلا جاتا ہے اور کلیجہ منہ کو چلا آتا ہے۔ جگر کباب ہو گیا: سچ جان! میں آج کسی صورت سے اس گھر میں نہ رہوں گی۔ اور اپنے جانی کے پاس خواہ نہ خواہ جاؤں گی تو بھی جلد رخصت کر۔ توتا اپنے جی میں ڈرا۔ اور کہنے لگا۔ خدا حافظ! یقین ہے۔ کہ یہ اب اس گھر میں کسی طرح سے نہ رہے گی۔ کیونکہ نہایت بے قراری رکھتی ہے اور میری بھی بات نہ سنے گی۔ از بس کہ مضطر ہے یہ سوچ کر بہ لاچاری کہنے لگا۔

اے بانو! میں تجھے ہر شب رخصت کرتا ہوں۔ اور خدا سے چاہتا ہوں کہ تو اپنے یار غمگسار سے ملے۔ تو آپ ہی توقف کرتی ہے۔ جو نہیں جاتی۔ یہ نہیں معلوم کہ نصیب تیرے کیسے ہیں؟ جو برگشتہ رہتے ہیں۔ لے بسم اللہ۔ اب دیر نہ کر۔ جا اور اپنے یار کو گلے لگا۔ پر یہ بات یاد رکھنا۔ کہ کسی دشمن کا اعتبار نہ کرنا۔ نہیں تو تجھ پر بھی وہی صدمہ گزرے گا جو اس امیر زادے پر اس سانپ کے سبب سے پہنچا۔

خجستہ نے پوچھا۔ اس کی حکایت کیوں کر ہے؟ بیان کر۔

توتا کہنے لگا۔ کہ کسی دن ایک امیر کسی جنگل میں شکار کھیلنے گیا تھا۔ اور ایک کالا سانپ کہیں سے بھاگا ہوا نہایت بدحواسی سے اس کے پاس آیا اور کہنے لگا۔ اے امیر! اپنے خدا کے واسطے مجھ کو جگہ دے کہ میں چھپ رہوں۔ اور تجھ کو دعا دوں۔ امیر نے پوچھا۔ کہ اس قدر کیوں گھبراتا ہے؟ خیر تو ہے؟ سانپ نے کہا۔ کہ دشمن میرا مجھے مارنے کو ہاتھ میں لاٹھی لیے ہوئے چلا آتا ہے۔ تو مجھے چھپا رکھ۔

یہ بات سنتے ہی امیر کو اس پر رحم آیا۔ اور اسے اپنی آستین میں چھپا رکھا۔ بعد ایک دم کے وہ شخص بھی ایک موٹا سا بانس لیے ہوئے آیا۔ اور کہنے لگا۔ کہ ایک کالا سانپ ابھی ابھی میرے آگے ادھر آیا ہے۔ کسی نے اسے دیکھا ہو۔ تو مجھے بتا دے۔ میں اس کا اس بانس سے سر پھوڑوں کہ اپنے گھر کی راہ لوں۔ اتنے میں امیر نے کہا۔ بھائی! میں یہاں بڑی دیر سے کھڑا ہوں۔ لیکن میں نے تو نہیں دیکھا۔ خدا جانے کہاں گیا؟ اور اس نے بھی اسے خوب سا ادھر ادھر تلاش کیا۔ جب کہیں نہ پایا تب اپنے گھر کا رستہ پکڑا۔

بعد ایک گھڑی کے امیر نے کہا۔ اے سانپ دشمن تیرا گیا۔ اب تو بھی جا۔ تب سانپ ہنسا اور کہنے لگا۔ اے امیر! اب میں تجھے بے ڈسے تو نہیں جانا۔ اور تیری بات کب سنوں گا؟ اب بے مارے کوئی یہاں سے ٹلتا ہوں؟ تو نہیں جانتا احوال میرا۔ کہ میں دشمن ہوں تیرا۔ جب تجھ کو ماروں گا۔ تب جاؤں گا۔ اور تو نہایت احمق معلوم ہوا۔ جو تو نے مجھ پر رحم

کھایا۔ اور میرے کہنے پر اعتبار کیا۔ اور اپنی آستین میں رکھنے کو مکان دیا۔ تب امیر نے کہا۔

اے سانپ! میں نے تیرے ساتھ بھلائی کی ہے۔ اور تو میرے ساتھ برائی کیا چاہتا ہے۔ یہ بات نامناسب ہے۔ سانپ نے کہا۔ میں نے عقلمندوں سے سنا ہے۔ کہ بُروں کے ساتھ نیکی کرنا ایسا ہی ہے۔ جیسا نیکوں کے ساتھ بدی کرنا۔ یہ سن کر وہ ڈرا۔ اور اپنے جی میں کہنے لگا۔ کہ اب اسے کیونکر آستین سے نکالوں۔ اور اپنا جی بچاؤں۔ بعد تامل کے ایک بات ٹھہرا کر کہنے لگا۔ اے مارِ سیاہ! ایک اور سانپ آتا ہے۔ تو میری آستین سے نکل۔ ہم اور تو دونوں چل کر اس سے پوچھیں۔ اگر تیری بات پسند کرے۔ تو پھر جو چاہتا سو میرا کرنا۔ بارے یہ سخن اس کا اس نے سنا اور اس کی آستین سے نکل کر اس سانپ کی طرف چلا۔ تب اس نے فرصت پاکر ایک ایسا پتھر اس کے سر پر مارا۔ کہ وہ مرگیا۔ اور امیر جیتا اپنے گھر گیا۔

خجستہ نے یہ نقل سن کر کہا۔ اے توتے! میں نے تیرا کہنا قبول کیا اور نصیحت مانی۔ یہ تو بھی اس وقت یہ سخن میرا سن کر جلد مجھے رخصت دے ———

توتے نے کہا۔ بہتر۔ اب دیر مت کر۔ جا اور اپنے دوست سے مل۔ اور خوشیاں کر۔ بانو یہ سن کر چاہتی تھی۔ کہ جاوے اور اس کو گلے لگاوے اتنے میں صبح نمودار ہوئی۔ مرغ نے بانگ دی۔

خجستہ مرغ کو گالیاں دے دے کر توتے سے کہنے لگی۔ کہ اب صبح ہوئی۔ میں کیوں کر جاؤں؟ آخر کار جانا اس کا اس روز بھی موقوف ہوا تب یہ بیت پڑھی اور رونے لگی۔

اے مرغِ سحر آج اگر تجھ کو میں پاؤں
تو کچا ہی دانتوں سے تیرا گوشت چباؤں

تیسویں کہانی

جب آفتاب چھپا اور ماہتاب نکلا۔ خجستہ نہا دھو تھوڑا سا میوہ کھا۔ اطلس کا پائجامہ۔ مقیش کا ازاربند ڈالے۔ کا کلیوں دار کرتا۔ تاش کی سنجاف لگا۔ جالی کی کرتی۔ بنت کی انگیا بنارسی دوپٹہ۔ مسی کی دھڑی۔ پانوں کا لکھوٹا۔ آنکھوں میں سرمہ۔ بالوں میں کنگھی۔ اس طرح بناؤ ٹھناؤ کر۔ جواہر کے گہنے پاتے سے آراستہ ہو ایسی بنی ٹھنی کہ احوال اس کے سنگھڑاپے کا بیان نہیں کیا جاتا بموافق اس کے۔

●

وہ کنگھی کچھ یوں صفائی کے ساتھ
کہ ہو رشک سے جس کے دو ٹکڑے لاٹ
صفائی یہ پوشاک کی دیکھیو
نظر سوچ میں ہے کہ میلی نہ ہو

اس بانک بنا سے اٹھی۔ اور توتے کے پاس رخصت لینے گئی اور کہنے لگی۔ اے محرمِ راز دار میرے دمساز! اگر آج میرے احوال پر رحم کرے۔ اور رخصت دے تو میں جب تک جیتی رہوں گی۔ تب تک تیرے بارِ احسان سے سر نہ اٹھاؤں گی۔ کیونکہ ایک درد ایسا بے قراری کا پہلو سے اٹھتا ہے۔ کہ حال بے حال ہوا جاتا ہے۔

آنکھیں نہیں مندتی ہیں میرے دل کو تعب ہے
یارب! دل حیراں کو میرے کس کی طلب ہے
دم لینے نہیں دیتے ہیں۔ پیہم کے یہ نالے
کیا جانیئے کیا دل کو میرے درد کہ طعب ہے

توتا کہنے لگا مبارک ہو۔ تشریف لے جا۔ پر یہ بات یاد رکھنا جس سے چاہنا۔ اس سے آشنائی کرنا۔ مگر اپنے دل کا راز کسی سے مت کہنا۔ نہیں تو یہ بات تیری کھل جاوے گی۔ اور ہلاکت کو پہنچے گی۔ جس صورت سے اس زرگر نے اپنی جورو سے احوال کہا۔ اور مارا گیا۔

خجستہ نے پوچھا۔ اس کی حقیقت کیوں کر ہے؟ آگاہ کر۔

توتا کہنے لگا۔ کسی شہر میں ایک سنار نہایت مالدار تھا۔ اور ایک سپاہی اس سے بہ دل دوستی رکھتا تھا۔ اس کی آشنائی کو سچ جانتا تھا۔ اتفاقاً اس سپاہی نے ایک تھیلی اشرفیوں سے بھری ہوئی کہیں سے پائی اور نہایت خوشی حاصل کی۔ اور اس کو کھول کر گنا تو اڑھائی سو اشرفی تھی وہ سپاہی تھیلی لیے ہوئے خوشی خوشی سنار کے پاس گیا۔ اور کہنے لگا۔ میرے بخت اچھے تھے جو بے رنج و محنت اس قدر زر راہ سے میں نے پایا۔ حاصل کلام۔ وہ تھیلی سنار کو سونپی اور یہ بات کہی۔ کہ بھائی! یہ میری امانت اپنے پاس رہنے دے۔ جب چاہوں گا لے لوں گا۔

بعد کئی دن کے اس تھیلی کو سپاہی نے سنار سے طلب کیا۔ تب وہ کہنے لگا۔ اے سپاہی! تُو نے اسی واسطے مجھ سے آشنائی کی تھی کہ تہمت لگا دے۔ اور مجھے چور بنا دے؟ بھلا تھیلی تُو نے کب دی تھی؟؟

تُو جھوٹ کہتا ہے۔ کیا خوب۔ اب تُو یہاں سے جا۔ اور کسی بڑے مالدار پر تہمت لگا۔ جس کے سبب سے کچھ مزہ اٹھا دے گا۔ اور مجھ غریب کے ستانے سے کیا پا دے گا۔ میں تجھے اپنا دوست جانتا تھا اور یہ کب معلوم تھا۔ کہ تُو دشمن ہو گا۔ اب جھوٹ سچ لگا۔ کہ مجھ سے مال لیا چاہتا ہے۔ مثل مشہور ہے۔ الٹے چور کوتوال کو ڈانٹے۔ جھوٹے کے آگے سچا رو پڑے۔

آخر کار اس سپاہی نے بہ لاچاری قاضی کے پاس جا کر فریاد کی اور یہ حقیقت مو بہ مو اس سے جا کر کہی۔ جب قاضی نے اس سے پوچھا کہ اس بات کا کوئی گواہ ہے؟ اس نے کہا۔ حضرت سلامت! ساکھی کوئی نہیں۔ قاضی نے عقل سے معلوم کیا۔ یہ قوم سناروں کی دغاباز ہوتی ہے۔ کچھ تعجب نہیں۔ اس سنار نے خواہ نہ خواہ دغابازی کی ہو گی اس احتمال پر سنار کو اور اس کی سنارنی کو بلوا بھیجا۔ اور ہر چند دم دلاسہ دے کر پوچھا۔ پر انہوں نے سوا انکار کے ہرگز اقرار نہ کیا تب قاضی نے کہا۔ میں خوب جانتا ہوں۔ مقرر تُو نے اس کی تھیلی اڑائی ہے جب تک اس کی تھیلی نہ دے گا تب تک تجھ کو نہ چھوڑوں گا۔

یہ کہہ کر قاضی گھر میں گیا اور دو شخصوں کو ایک صندوق میں بند کیا اور اس صندوق کو کوٹھڑی میں دھر دیا۔ پھر باہر نکل کر سنار سے کہا۔ اگر اس کا زر دینا قبول نہ کرے گا۔ تو میں فجر کو تجھے مروا ڈالوں گا۔ یہ کہہ

کر ان دونوں کو اس کوٹھڑی میں قید کیا۔ اور فرمایا۔ کہ صبح کو بعد نماز کے تمہیں قتل کروں گا۔ یہ کہہ کر قاضی جی اندر گئے۔ اور وے دونوں اس جگہ قید رہے۔ جب آدھی رات گزری۔ تب اس کی جورو نے کہا۔ اگر تُو نے اس کی تھیلی لی ہے۔ تو مجھے بتا دے۔ کہاں رکھی ہے۔ اور نہیں تو اس تھیلی کے ساتھ میری بھی جان جاوے گی۔ یہ قاضی بے تھیلی لیے ہم کو ہرگز جیتا نہ چھوڑے گا۔ تب اس سنار نے کہا۔ فلانی جگہ جہاں میری چارپائی بچھی ہے۔ وہیں وہ تھیلی بھی گڑی ہے۔

یہ بات ان دونوں شخصوں نے اپنے کانوں سے سنی۔ اتنے میں صبح ہوئی۔ جب قاضی نے ان چاروں کو کچہری میں بلوایا۔ اور ان دونوں شخصوں سے پوچھا۔ سچ کہو۔ رات کو ان دونوں نے آپس میں کیا باتیں کی تھیں؟ تب قسم کی رُو سے انہوں نے جو سنا تھا۔ سو کہہ دیا۔ قاضی نے اس جگہ سے وہ تھیلی اپنے لوگوں کے ہاتھ منگوا کر سپاہی کے حوالے کی اور سنار کو سُولی دی۔

توتے نے یہ کہہ کر خجستہ سے کہا۔ اگر زرگر اپنا احوال جورو سے نہ کہتا۔ تو مارا نہ جاتا۔ خیر اب سدھاریئے اور اپنے معشوق سے مل کر مزا جوانی کا اٹھایئے۔ خجستہ نے یہ سنتے ہی چاہا کہ اپنے تئیں اس کے پاس پہنچادے اور اس کو اپنے گلے لگا دے۔ اتنے میں نور کا تڑکا ہوا۔ اور مرغ بولا جانا اس کا اس روز بھی موقوف رہا۔ تب یہ فرد پڑھی۔ اور منہ ڈھانپ کر رونے لگی۔

وصل کی جس سحر سے چھوٹے شب
اس سحر کو خدا نہ دکھلاوے

اکتیسویں داستان

جب سورج چھپا اور چاند نکلا۔ خجستہ پوشاک بدل اور جواہر پہن توتے کے پاس رخصت لینے گئی اور کہنے لگی اے توتے! تیرے قربان جاؤں۔ مجھ پر رحم کر اور رخصت دے۔ کیونکہ آج پھر کچھ جی گھبراتا ہے۔ اور دل ٹکڑے ہوتے جاتا ہے۔

یاد میں تڑپے ہے دل کس ابروے خمدار کی
آج کچھ ناخن بہ دل ہے آہ اس بیمار کی

چاہتی ہوں کہ آدھی رات کو اس کے پاس جاؤں۔ تو بھی اس وقت ایک حکایت چھوٹی سی کہہ۔

توتا بولا۔ اے خجستہ! کسی شہر میں ایک سوداگر تھا۔ نہایت مال دار لیکن وہ بے اولاد تھا۔ ایک دن یہ اس کے دل میں خیال گزرا۔ اور اپنے جی میں کہنے لگا۔ اگرچہ میں نے اس جہان میں دولت بے شمار پیدا کی۔ پر کچھ حاصل نہیں۔ کس واسطے کہ ایک بھی لڑکا نہ ہوا۔ جو بعد میرے اس گھر کو روشن کرتا۔ اور اس دولت کو اپنے قبضے میں لاتا۔ اپنے جد آبا کا نام رکھتا۔

افسوس صد افسوس۔

کسی طرف سے کچھ نہیں مجھ کو غم
مگر ایک اولاد کا ہے الم

خیر اب بہتر یہی ہے۔ کہ اپنے جیتے جی اس زر بے بنیاد کو بنام مولا لٹائیے۔ اور فقیر فقرا۔ غریب غربا۔ یتیموں کو کھلایئے۔ اور آپ فقیر ہو کر یادِ الٰہی میں مشغول رہیئے۔

اہلِ فنا کو نام سے ہستی کے ننگ ہے
لوحِ مزار بھی مری چھاتی پہ سنگ ہے

یہ بات جی میں ٹھہرا کر گریبان مثلِ گل چاک کر ڈالا۔ اور یہاں تک زر نقد صبح تا شام لٹایا۔ کہ ہر ایک غریب غنی ہو گیا۔ آپ ایک ٹوٹے سے بوریئے پر لنگوٹا کھینچ اسی طرح بھوکا پیاسا پڑ رہا۔ اس شب کو بعد آدھی رات کے کیا خواب دیکھتا ہے کہ ایک شخص اجنبی سا اس کے سامنے کھڑا ہے۔ اس نے اس سے پوچھا۔

اے عزیز تو کون ہے؟ وہ بولا۔ میں اصل صورت تیرے بخت کی ہوں۔ تُو نے آج اپنا مال و اسباب خدا کی راہ میں خیرات کیا۔ اور کچھ اپنے واسطے نہ رکھا۔ اس واسطے میں کہنے آیا ہوں۔ صبح کو برہمن کی صورت بن کر تیرے پاس آؤں گا۔ تو مجھے مارے لاٹھیوں کے مار ڈالنا۔ جس گھڑی میرا دم بدن سے نکلے گا۔ تمام سونے کا بن جاوے گا۔ جس عضو کو تُو چاہنا کاٹ لینا۔ وہ عضو پھر اسی وقت درست ہو جائے گا اور تیرے ہاتھ بہت سا سونا لگے گا۔

یہ بات اس کا نصیب کہہ کر ادھر گیا۔ اور ادھر صبح کا تارا نمودار ہوا۔ جب اس کی آنکھ کھل گئی۔ سوائے اپنے اور اس ایک بوریئے کے کچھ نہ دیکھا۔ اپنے دل میں متعجب ہو کر کہنے لگا۔

الٰہی! یہ میں نے کیا سپنا دیکھا! تعبیر اس کی کیا ہے؟ مجھے کچھ نہیں معلوم۔ تو کریم کارساز ہے۔ جو چاہے سو کرے۔ اسی حیرانی میں تھا۔ کہ ایک حجام اپنی کسبت بغل میں دبائے ہوئے اس کی طرف ہو نکلا اس نے پکار لیا۔ اور اپنا سر منڈانے لگا۔

بعد ایک دم کے ایک برہمن اس کے سامنے آیا۔ تب اسے وہ اپنا رات کا خواب یاد پڑا۔ اسی گھڑی سر منڈوانا موقوف کیا۔ اور اس برہمن کو لاٹھیاں مارنے لگا۔ اور یہاں تک مارا کہ وہ اپنے جی سے گیا۔ زمین پر گر کے ایک پتلا زرِ سرخ کا ہو گیا۔

سوداگر نے اس پتلے کو اپنے گھر میں رکھا۔ اور تھوڑا سا سونا نائی کو دے کر کہا۔ کہ تو یہ بات کسی سے نہ کہنا۔ اور وہ استاد اپنے جی میں بہت سا خوش ہوا۔ کہ یہ نسخہ کیمیا کا حق تعالٰے نے اچھا دیا۔ غرض اس سونے کو بغل میں مار کر جلدی جلدی اپنے گھر آیا اور ایک لاٹھی موٹی سی ہاتھ میں لے کر دروازے پر اس تاک میں بیٹھ رہا کہ کوئی برہمن اس طرف سے آوے۔ تو اسے مارے اور سونا بنائے۔ اتنے میں ایک گروہ برہمنوں کا ادھر سے آ نکلا۔ اور اس نے ان کو اپنے گھر میں بلایا۔ اور ان کی ضیافت میں دل لگایا۔

بعد ایک گھڑی کے ایک لاٹھی موٹی سی اٹھا کر ان کو بے اختیار پیٹنے لگا۔ اور یہاں تک مارا۔ کہ سر ان کے پھوٹے اور لہولہان ہو گئے۔ تب وہ سب کے سب غل مچانے لگے۔ کہ کوئی واسطے گوسیاں کے آوے

نہیں تو ہم اس حجام کے ہاتھ مفت مارے جاتے ہیں۔

یہ سن کر محلے والے دوڑے اور نائی کو باندھ کر حاکم کے پاس لے گئے اور کہنے لگے۔ خداوندا! دیکھیے۔ ہم تو اب اس زمانے پر مرتے ہیں۔ کہ آپ کے عمل میں نائی برہمنوں کا خون کرتے ہیں۔ حاکم نے حجام سے پوچھا کہ تو نے کس تقصیر پر ان غریبوں کو مارا۔ اور کس خطا پر ان بیچاروں کا سر پھوڑا۔ اس نے کہا۔

حضرت سلامت! میں آج فجر کو فلانے سوداگر کی اصلاح بنانے گیا تھا۔ میرے سامنے ایک برہمن اس کے پاس آیا۔ اس نے دو چار لاٹھیاں اسے ماریں۔ وہ مرتے ہی سونا ہو گیا۔ میں نے معلوم کیا کہ اگر کوئی برہمن کو لکڑیاں مارے۔ تو وہ سونا ہو جائے۔ میں نے بھی اپنی اس طمع پر برہمنوں کو مارا۔ کہ شاید یہ زر ہو جاویں گے۔ افسوس یہ ہے کہ کوئی برہمن زر تو نہ ہوا۔ بلکہ اور فتنہ برپا ہوا۔ یہ خطا مجھ سے ہوئی۔ جو چاہیئے۔ سو کیجیئے۔ تب حاکم نے اس سوداگر کو بلوا کر کہا۔ کہ یہ حجام کیا کہتا ہے! سو اور جو احوال سچ ہو کہو۔ میں نے یوں سنا ہے۔ کہ تم نے آج ایک برہمن کو مار کر سونا بنایا ہے۔ اور یہ نائی بھی کئی برہمنوں کو ادھموا کر کے کشتہ کیا چاہتا تھا۔ اس نے کہا۔ بندہ نواز! یہ میرا نوکر ہے۔ آج کئی دنوں سے دیوانوں کی طرح پڑا پھرتا ہے۔ جسے چاہتا ہے۔ اسے مارتا ہے۔ تمام شہر میں غل مچاتا ہے۔ مجھ کو کیا۔ مثل مشہور ہے۔ جس کا خون اس کی گردن۔ آپ حاکم ہیں۔ جو مناسب جانیں کریں۔ میں کس واسطے کسی کو ماروں گا۔

حاکم نے اس کا کہا باور کیا۔ اور ان سبھوں کو دم دلاسا دے کر رخصت کر دیا۔ پھر اس حجام کو سزا دی۔

توتے نے یہ بات کہہ کر خجستہ کو کہا۔ اگر جانا ہے تو جا۔ کیونکہ اب وقت آخیر ہے۔ اور نہیں۔ تو کل سر شام ہی سے چلے جانا۔ بانو نے ہر چند چاہا۔ کہ جاوے۔ اور اپنے دلبر سے ملے۔ اتنے میں صبح صادق ہوئی۔ مرغ نے بانگ دی۔ جانا اس کا اس روز بھی موقوف ہوا۔ تب یہ بیت پڑھتی اور رونے لگی۔

ہجراں کی شب و روز کا یک طرفہ الم ہے
شب گزرے ہے اندوہ میں اور دن کو بھی غم ہے

بتیسویں کہانی

جب سورج چھپا اور چاند نکلا۔ خجستہ رخصت لینے توتے کے پاس گئی۔ اور کہنے لگی۔ اے توتے! کچھ میرے بھی احوال سے واقف ہے کہ اب دن بدن ناتواں ہوئی جاتی ہوں اور رنگ نقاہت سے زرد ہوا جاتا ہے۔ جہاں کی کسی چیز پر جی نہیں لگتا۔ اور کسی سے بولنے کو جی نہیں چاہتا۔

تجھ بن اب تو غم سے فرصت ایک ذرا ہیہات نہیں
دامن سے منہ ڈھانکے رہنا۔ رونا پہروں بات نہیں
سبب کیا کہ دل سے تعلق ہے سب
نہ ہو دل تو پھر بات بھی ہے غضب

توتا کہنے لگا۔ کہ اے بانو! کچھ اندیشہ نہ کر۔ اور دل میں راہ ناامیدی کو نہ دے۔ خدا پر نظر رکھ۔ کہ وہ مسبب الاسباب ہے۔ دعا تیری قبول کرے گا۔ اور تمنائے دلی بر لاوے گا۔

نہ کرنا کبھی یاس کی گفتگو
کہ آیا ہے قرآن میں لاتقنطوا

اب تیرے کام میں سعی کرتا ہوں۔ کس واسطے تو اپنی اس جوانی کو جلاتی ہے اور کیونکہ آنکھوں میں آنسو دم بدم بھر لاتی ہے۔ مقرر تیرے دوست کے پاس پہنچاؤں گا۔ خجستہ کہنے لگی۔

اے پیارے! تعجب ہے کہ ہم دونوں ایک دل ہو کر کوشش کرتے ہیں تس پر بھی یہ کام سرانجام نہیں ہوتا۔ یہ کیا حکمت الٰہی ہے۔ اور میرے کیسے برگشتہ نصیب ہیں۔ کہ آٹھوں پہر پھرے ہی رہتے ہیں۔ ہیہات ہیہات! توتا کہنے لگا۔ اے خجستہ! یہ کیا کٹھن ہے۔ تو نے نہیں سنا۔ کہ مینڈک و زنبور و مرغ ہر ایک آپس میں متفق ہوئے۔ اور ہاتھی کو مار ڈالا۔ باوجود اس کے کہ وہ ہر ایک جانور سے ہیبت ناک تھا۔ اور یہ کونسا بڑا کام ہے کہ وہ ہم سے اور تم سے نہ ہو گا۔

انشاء اللہ تعالےٰ قریب ہے کہ تو اپنے یار سے ملے۔ چین کرے۔ خجستہ نے یہ سن کر کہا۔ کہ تیرے منہ میں گھی شکر۔ خدا تجھ کو خوش رکھے۔ جو تو ایسی باتیں کر کے میرا جی بہلاتا ہے۔ پر ان کی نقل کیونکر ہے۔ بیان کر۔

توتا کہنے لگا۔ کسی شہر میں ایک درخت تھا اور اس کی ڈالیاں گنجان تھیں اس پر ایک شکر خورے کے جوڑے نے اپنا گھونسلا بنا کر انڈے دیئے تھے۔ اتفاقاً ایک بیل مست اس جگہ پہنچا اور اس درخت سے اپنی پیٹھ رگڑنے لگا۔ اس صدمے سے وہ درخت ہلا۔ بیضے گر پڑے۔ تب وہ شکر خورا ڈر کے مارے اپنی مادہ کو چھوڑ کر ایک اور درخت پر جا بیٹھا۔ اور آہ و زاری کرنے لگا۔ مثل مشہور ہے کہ بلی کے آگے چوہے کا کیا بس چلے۔ لیکن اپنے جی میں کہتا تھا کہ اس دشمن زبردست سے بدلہ کس طرح لیا چاہیئے۔

یہ خیال کر کے اپنے دوست کے پاس گیا۔ کہ جسے مرغ دراز نوک کہتے ہیں۔ احوال گزرا ہوا سب اس کے آگے کہا۔ کہ ناحق ایک فیل نے میرے اوپر ظلم کیا ہے۔ کچھ ایسی تدبیر کر کہ وہ مارا جائے۔ اور میں اپنی داد کو پہنچوں۔ میرا بدلا اس سے لے۔ کیونکہ دوست ہی وقت پڑے پہ کام آتے ہیں۔

اس نے کہا۔ بھائی! ہاتھی کا مارنا بہت دشوار ہے۔ مجھ اکیلے سے نہ ہو سکے گا۔ مگر ایک زنبور ہے۔ میں اس کو نہایت دوست سمجھتا ہوں اور وہ مجھ سے نہایت دانا ہے۔ اس سے مشورت کیا چاہیئے۔ وہ جو کہے سو کیجیئے۔ بغرض دونوں نے اپنے تئیں اس کے پاس پہنچایا۔ اور یہ احوال ظاہر کیا۔ یہ ماجرا اس نے سن کر ترس کھایا۔ اور کہا۔ کہ میں ایک مدت سے دوستوں کے کام پر کمر باندھے پھرتا ہوں۔ مگر میرے ساتھ ایک غوک بہ خوبی تمام آشنائی رکھتا ہے اور اپنی قوم کے لشکر کا سردار بھی ہے۔ اس سے اس بات کو سنایئے۔ وہ جو کہے۔ اس پر عمل کیجیے۔ کیونکہ تدبیر اس کی خطا نہیں کرتی۔

بہر صورت ان تینوں نے اپنے تئیں اس مینڈک کے پاس پہنچایا

اور اس احوال کو مو بہ مو ظاہر کیا۔ اور اس سے مدد چاہی۔ تب غوک نے شکر خورے کے احوال پر اور انڈوں کے ٹوٹنے پر بھی رحم کھایا۔ اور کہا کہ اے شکر خورے! تو خاطر جمع رکھ۔ مجھ کو ابھی اس کے مارنے کی ایک ایسی حکمت سوجھی ہے۔ جس سے پہاڑ کو پست کرتے ہیں۔ وہ چیز کیا ہے چاہیئے۔ اور وہ تدبیر یہ ہے کہ پہلے زنبور اس کے پاس جائے اور اپنی آواز دلچسپ سے اسے مست کرے۔ جب وہ مستی پر آوے۔ تب یہ مرغ دراز نوک اپنی چونچ سے اس کی آنکھیں نکال لے۔ کہ یہ جہان روشن اس کی آنکھوں میں تاریک ہو جاوے۔ پھر بعد کئی دن کے جب یہ مارے پیاس کے نہایت تنگ ہو گا۔ تب اس کے سامنے میں بولنا شروع کروں گا اور وہ معلوم کرے گا کہ جس جگہ مینڈک بولتا ہے۔ وہاں مقدر پانی ہوتا ہے۔ اس شبہ سے وہ اٹکل سے آگے قدم بڑھا دے گا۔ اور میں پچھلے پاؤں ہٹوں گا۔ اسی طرح سے آہستہ آہستہ بہلائے بہلائے لے جاؤں گا اور ایک ایسے غار عظیم میں گرا دوں گا۔ کہ پھر اس کی کوئی آواز بھی نہ سنے گا۔ اور وہ بھی وہاں سے قیامت تک نہ نکل سکے۔ آپ ہی آپ سسک سسک کر مارے بھوک کے مر جاوے گا۔ آخر کار اسی بات پر وہ ہر ایک آپس میں متفق ہوا۔ اور اسی ڈھب سے اس ہاتھی کو ہلاک کیا۔

توتے نے یہ سخن یہاں تک پہنچا کر کہا۔ اے خجستہ بانو! ان دو تین ضعیف جانوروں نے ہمت باندھی۔ تو ایسے ہاتھی کو مارا۔ اور اپنا بدلہ لیا۔ تو کیوں ٹھنڈی آہیں بھرتی ہے؟ ہم بھلا دونوں شخص ہمت باندھیں گے۔ تو یہ کیا دخل ہے۔ جو کام نہ ہو۔ تو نے نہیں سنا۔ کہ لوگ کہتے ہیں … ہمت کا رہا دارد! جو ڈھونڈے گا۔ سو پاوے گا۔ بی بی خوش ہو۔ اب جا اور اس سے مل۔ خجستہ نے یہ سنتے ہی چاہا۔ کہ جاوے۔ اور اسے گلے لگا دے۔ کہ اتنے میں پو پھٹی۔ اور مرغ نے بانگ دی۔ جانا اس کا اس روز بھی یوں ہی موقوف رہا۔ تب یہ فرد زبان پر لائی۔ اور بے اختیار رو رو کر چلائی۔

اس سحر کی ولا عداوت سے
شام ہوتی نظر نہیں آتی

تیئیسواں قصہ

جب سورج چھپا۔ اور چاند نکلا۔ تب خجستہ آنکھیں سرخ رنگ زرد۔ ہونٹ نیلے۔ مو پریشان۔ چاک گریباں۔ آہ سرد۔ کپڑے میلے۔ حال تباہ۔ سوگواروں کی صورت بنائے ہوئے توتے کے پاس رخصت لینے آئی۔ اور کہنے لگی۔ اے توتے! میں نے اکثر بزرگوں کی زبانی سنا ہے کہ ایک شخص نے کسی دانا سے جا کر پوچھا کہ عشق کیا چیز ہے۔ تب اس نے کہا۔ کہ عشق کو ملک الموت کہتے ہیں اور جاننے والے اس کو آفت ناگہانی سمجھتے ہیں۔

عشق جس کے تئیں ستاتا ہے
وہ بے چارہ جہاں سے جاتا ہے

اور میرا بھی احوال اس کم بخت نے یہاں تک پہنچایا ہے کہ جی ہی جانتا ہے۔ اب یہی دل میں آتا ہے کہ اس کو موقوف کروں۔ اور صبر کر کے بیٹھ رہوں۔ مثل مشہور ہے۔ بھٹھ پڑے وہ سونا جس سے ٹوٹے کان۔ توتا کہنے لگا۔

اے خجستہ! کہنے سے اور کرنے سے بڑا فرق ہے۔ یہ کیا کہتی ہے؟ عاشق کو صبر سے کیا نسبت؟ اور بیمار کو آہ و زاری سے کب فرصت۔

جسے عشق اثیر کاری لگے
اسے زندگی جگ میں بھاری لگے

ایک عاشق بے معشوق رہتا تو کوئی کسی پر نہ مرتا۔ اور وہ بھی بادشاہ زادی اپنا بیاہ نہ کرتی۔ کس واسطے کہ وہ ایک مدت تک مرد کے نام سے بیزار تھی۔ آخر بے شوہر نہ رہ سکی اور خصم کر ہی بیٹھی۔ خجستہ نے پوچھا۔ کہ اس کی داستان کیوں کر ہے؟ بیان کر۔

توتا کہنے لگا کہ کسی وقت چین کا بادشاہ نہایت عقلمند تھا۔ اور ایک وزیر عقلمند بھی رکھتا تھا۔ اتفاقاً وہ ایک دن اپنے محل میں بے خبر سوتا تھا۔ اتنے میں اس کے وزیر کو کچھ ایسی ہی کار ملک میں مصلحت کرنی ضرور ہوئی۔ کہ آن کر اس نے اپنے بادشاہ کو بیدار کیا۔ اور وہ چونکتے ہی تیغا کھینچ کر اس کے پیچھے پڑا۔ اور وہ اس کے آگے سے بھاگ کر کسی کے گھر جا کر چھپ رہا۔ تب یہ طیش میں بھرا ہوا اپنے تخت پر جا بیٹھا اور مونچھوں کو تاؤ دینے لگا۔ اور ہاتھ زانوں پر مارتا تھا۔ اور جامہ گلے کا پھاڑتا تھا۔ بے اختیار ہو ہو کر غل مچاتا تھا۔

ارکانِ دولت نے عرض کی کہ جہاں پناہ! آپ کو کیا ہوا ہے؟ ان خانہ زادوں کو یہ کچھ معلوم نہیں ہوتا۔ اور اس نے کیا ایسی تقصیر کی ہے کہ جس کے واسطے قبلۂ عالم نے اتنی تکلیف کھینچی۔

کچھ ارشاد ہو۔ تاکہ ہم بھی اس بے ادبی سے باز رہیں۔ اور نمک حلالی پر کمر باندھیں۔ تب بادشاہ نے ان پر رحم کھایا اور یہ فرمایا۔ کہ بھائی! میں ابھی سوتے سوتے کیا خواب دیکھتا ہوں کہ میں کسی بادشاہت میں گیا ہوں۔ اور وہاں کی شہزادی سے اختلاط کرتا ہوں۔ کبھی میرے ہاتھ کی چٹکی لیتی ہے اور کبھی میں اس کے پاؤں پہ سر رکھتا ہوں۔ اتنے میں اس وزیر کم بخت نے اگر خواہ نہ خواہ مجھ کو جگا دیا۔ اور زندگی سے بے مزہ کیا۔ اس بات کو سن کر انہوں نے عرض کی۔ کہ خداوندا شہزادی کیسی تھی؟ تب بادشاہ نے ایک آہ کھینچی اور یہ قطعہ پڑھا۔

تعلق سے چھڑا دے شاد کر دے
الٰہی! اب مجھے آزاد کر دے
میرے شیریں دہن کی کچھ نہ پوچھ
جسے چاہے اسے فرہاد کر دے

●

اتفاقاً ان وزیروں میں سے ایک وزیر کار مصوری جانتا تھا۔ اس نے بموجب فرمائش بادشاہ کے اس شہزادی کی شکل کے موافق ایک تصویر کھینچی۔ اور آپ ایک گزرگاہ میں جا بیٹھا۔ اور جو کوئی ادھر سے مسافر دور دراز کے راستے سے آتا تھا۔ تو یہ اس سے بھی پوچھتا۔ کہ تو نے اس صورت کی کہیں عورت دیکھی ہے؟ تو مجھے خبر دے۔ یا سنی ہو۔ تو کہہ دے۔ پر کوئی شخص اس کا جواب نہ دیتا تھا۔

اتفاقاً بعد ایک مدت کے کسی طرف سے ایک سیاح آن کر نکلا۔ اور اس کے ساتھ بیٹھ کر کچھ ناشتہ کرنے لگا۔ جب اس وزیر نے اسے وہ تصویر دکھائی۔ اور یہ بات کہی۔ کہ اے فقیر!

سچ کہہ۔ تو نے اس شکل کی رنڈی دیکھی ہے؟ تب اس درویش نے کہا۔ بابا! میں اس سے خوب واقف ہوں۔ یہ روم کی شہزادی ہے۔ باوجود اس حسن کے آج تک اس نے کسی کو شوہر نہیں کیا۔ بلکہ مرد کے نام سے خفا ہوتی ہے۔ تب اس وزیر نے پوچھا کہ وہ کس واسطے خانہ داری نہیں کرتی؟ تب اس نے کہا۔ میں اس بات کو بھی خوب جانتا ہوں۔ وہ یہ سبب ہے کہ کسی وقت میں وہ شہزادی بارہ دری میں بیٹھی ہوئی ایک باغ کی سیر کر رہی تھی۔ اور اس باغ میں ایک طاؤس کے جوڑے نے کسی درخت کے اوپر انڈے دیئے تھے۔ اور آپس میں ملے ہوئے ان انڈوں کو سے رہے تھے۔ اتنے میں اس گلستان میں آگ لگی۔ یہاں تک کہ تمام درخت و گل جل گئے۔ بلکہ اس کی آگ سے وہ بھی درخت بھڑک اٹھا۔ جب اس جوڑے میں سے نر کو آگ برداشت نہ ہوئی۔ ناچار مادہ کو وہیں چھوڑ کر آپ اس آشیانے سے پرواز کر گیا۔ اور اس کی مورنی نے ہر چند کہا۔ اے مور! اس وقت مجھ کو اس آفت میں نہ چھوڑ۔ اگر تو میری الفت سے نہیں رہتا۔ تو ان پر بھی رحم نہیں کرتا؟ اس نے ہرگز اس کا کہنا نہ مانا۔ اور وہاں سے اڑ ہی گیا۔ وہ مورنی مارے محبت کے ان انڈوں پر سے نہ اٹھی۔ اور وہیں جل کر راکھ ہو گئی۔

شہزادی نے جس روز سے یہ بے وفائی نر کی دیکھی ہے۔ اسی دن سے تا حال مرد کا نام نہیں لیتی۔ اور خانہ داری نہیں کرتی۔ بلکہ اس بات کا عہد کیا ہے۔ کہ کبھی مرد کا نام نہ لوں گی۔

وزیر اس بات کو سنتے ہی نہایت خوش ہوا۔ اور جا کر اپنے بادشاہ سے عرض کرنے لگا۔ کہ جہاں پناہ نے جس شہزادی کو خواب میں دیکھا تھا۔ اور میں اس کی تصویر ایک کاغذ پہ کھینچ کر راہ میں بیٹھ رہا تھا۔ جو کوئی ادھر سے گزر کرتا تھا۔ میں اسے وہ تصویر دکھاتا تھا۔ اور اس کا نشان پوچھتا تھا۔ بارے آج ایک فقیر کہیں سے جو آیا۔ میں نے یہ تصویر اسے دکھلائی اس نے دیکھتے ہی کہا۔ کہ یہ تصویر روم کی بادشاہ زادی کی ہے۔ بادشاہ اس مژدے سے بہت خوش ہوا۔ اور کہنے لگا۔

اے وزیر! آج ہی کسی آدمی کو شہر روم میں بھیجو کہ وہ اس ملکہ کی خواستگاری کرے۔ وزیر نے جناب بادشاہ میں عرض کی۔ جہاں پناہ! وہ اپنا بیاہ نہیں کرتی۔ بادشاہ نے کہا۔ اس میں کیا بھید ہے۔ میں نہیں سمجھتا۔ وزیر نے جو احوال طاؤس کا اس فقیر سے سنا تھا۔ جوں کا توں بادشاہ کے سامنے ظاہر کیا۔ یہ احوال سن کر بادشاہ نے کہا۔ پھر کیا کیا چاہیئے؟ وزیر نے عرض کی۔ اگر حکم ہو تو میں جاؤں۔ اور تصویر خداوند کی اسے دکھلاؤں۔

جس صورت سے تم اس کی صورت خواب میں دیکھ کر عاشق ہوئے ہو۔ وہ اسی طرح غالباً آپ کی تصویر دیکھ کر آشفتہ ہو۔ آخر کار وزیر حضور پُرنور سے رخصت ہوا۔ اور اس ملک میں جا پہنچا۔ اور اپنے تئیں مصوروں میں مشہور کیا۔ یہ خبر اس ملکہ کو پہنچی۔ کہ ایک مصور تمہارے شہر میں لاثانی آیا ہے۔ کہ ایسا نہ دیکھا۔ نہ سنا۔ تب شہزادی نے کہا۔ اس کو ہمارے پاس لے آؤ۔ کہ ہمارے محل میں نقش و نگار کرے اور جیسی تصویریں اس کا جی چاہے ویسی کھینچے۔

حاصل کلام۔ وزیر اس کے محل میں گیا۔ اور اپنے ہی بادشاہ کی تصویر مع شکارگاہ اس کے محل میں کھینچی۔ شہزادی نے جو نقش و نگار تصویرات کو دیکھا۔ تو متعجب ہو کر کہنے لگی۔ یہ تصویر کس کی ہے؟ اور کونسی جگہ ہے؟ اس نے عرض کی۔

اے شہزادی! یہ تصویر چین کے بادشاہ کی ہے اور یہ شکارگاہ اسی کے رمنے کی مشابہت ہے۔ اور یہ جانور اور یہ ہرن اور یہ بچے ہرن کے انہیں جانوروں کی سی ہیئت رکھتے ہیں۔

ایک دن یہ بادشاہ اپنے بالاخانے پہ بیٹھا ہوا صحرا کی سیر کر رہا تھا۔ اتنے میں ایک طرف سے ایسا سیلاب آیا۔ کہ بس۔ اتفاقاً ایک جوڑا ہرن کا اپنے بچوں کو لیے ہوئے کسی درخت کے نیچے بیٹھا تھا سیل کو دیکھتے ہی ہرنی اپنی جان کی دہشت سے بچوں سمیت ہرن کو چھوڑ کر بے دردوں کی طرح بھاگی۔ ہرن ہر چند اس سے پکارتا رہا اے ہرنی! یہ بے وفائی کا وقت نہیں۔ مجھے مت چھوڑ۔ اور ان بچوں پر رحم کر۔ ان سے منہ نہ موڑ۔ اس نے یہ بات ہرن کی نہ سنی اور کیا جانیئے آپ کہاں چلی گئی۔ اور وہ ہرن مارے الفت کے بچوں سے جدا نہ ہوا۔ آخر اسی سیل میں بچوں سمیت ڈوب گیا۔

اے ملکہ! جس روز سے یہ بے مروتی اور بے دردی بادشاہ نے مادہ کی دیکھی۔ اسی دن سے اپنی شادی نہیں کرتا۔ بلکہ عورت کے نام سے سو سو کوس بھاگتا ہے۔

ملکہ نے جو یہ بات سنی۔ تو قصہ فغفور کا اپنی ہی ہمداستانی جانا اور کہا۔ اے مصور! احوال میرا اور اس کا ایک ساں ہے۔ کیونکہ میں نے مور کو بے رحم دیکھا۔ اس واسطے مرد سے ہاتھ اٹھایا۔ اور اس نے ہرنی کو بے درد سمجھ کر رنڈی سے کنارا کیا۔ اگر ہماری شادی اس کے ساتھ ہو تو کیا خوب ہو۔ آخر کار دوسرے روز شہزادی نے اپنا وکیل اس کے پاس بھیجا۔ اور اپنا نکاح پڑھوانے پر راضی ہوئی۔

توتے نے جب یہ کہانی یہاں تک پہنچائی۔ خجستہ سے کہا۔ اے بی بی تو کہتی ہے۔ میں اس سے دوستی ترک کروں گی۔ اگر یہ بات کسی سے ہو سکتی۔ تو وہ ملکہ اپنی شادی چین کے بادشاہ سے نہ کرتی۔ خیر اس سخن سے ہاتھ اٹھائیے۔ اور اپنے معشوق سے صحبتِ عیش گرم کیجئے۔

خجستہ نے یہ سنتے ہی چاہا۔ کہ اپنے تئیں اس کے پاس پہنچا دے اور اسے اپنے گلے لگا دے۔ اتنے میں گجر بجا۔ مرغ بولا۔ جانا اس کا اس روز بھی موقوف ہوا۔ تب یہ بیت پڑھی۔ اور بے اختیار آہیں بھرنے لگی۔

کاش کہ رات جی نکل جاتا
اس سحر کو خدا دکھلاتا

چونتیسویں کہانی

جب سورج چھپا۔ اور چاند نکلا۔ خجستہ پتلی گردن بھرے بازو۔ اُبھرا جوبن۔ نرم پیٹ۔ قد قامت گول سرین۔ چکنی رانیں۔ سنہری قوسیں۔ تیوری چڑھائے اشتیاق میں بھری ہوئی۔

قد و قامت آفت کا ٹکڑا تمام
قیامت کرے جس کو جھک کر سلام

توتے کے پاس رخصت لینے گئی۔ اور کہنے لگی۔ اے توتے! میں نے بارہا صاحب عزتوں کی زبانی سنا ہے۔ کہ عبدالعزیز نام ایک بادشاہ نہ شب کو سوتا۔ نہ دن کو آرام کرتا کسی شخص نے پوچھا۔ جہاں پناہ! یہ کیا سبب ہے! نہ دن کو سوتے ہو۔ نہ رات کو آرام کرتے ہو؟ اس نے کہا۔ اے عزیز! اگر شب کو سوؤں تو عبادتِ خدا نہ ہو سکے اور اگر دن کو سوؤں۔ تو رعیت تباہ ہو جائے۔ اس واسطے میں نے سونا شب و روز ۱۲ اپنے اوپر حرام کیا ہے۔ وہی احوال میرا ہوا ہے۔ اور اسی اندیشے میں پڑی رہتی ہوں۔ اگر یار کے پاس جاؤں۔ تو خاوند سے ہاتھ اٹھاؤں۔ اور اگر خاوند کے گھر میں رہوں۔ تو اس کی دوستی سے باز آؤں۔ جس سے بہتر یہی ہے کہ ان دونوں سے کنارہ کروں۔ اور آبرو عصمت سے ایک گوشے میں بیٹھ رہوں۔

دو رنگی چھوڑ دے۔ اک رنگ ہو جا
سراسر موم ہو یا سنگ ہو جا

یہ بات سنتے ہی توتا ایک قہقہہ مار کر ہنسا۔ اور کہنے لگا۔ اے خجستہ! اب حرمت ڈھونڈتی ہے۔ کیا خوب! ہر ایک چیز کا ہر ایک وقت ہے۔

سن بی بی! مثل مشہور ہے۔ جب روگ لگی۔ تب لاج کہاں؟

سودا ہوئے جب عاشق۔ کیا پاس آبرو کا
سنتا ہے اے دوانے! جب دل دیا تو پھر کیا

اے بی بی! اب کیا سوچتی ہے؟ خیر تیرا کلام بھی اس دراز گوش کی طرح ہوا۔ کہ بے محل گا اٹھا۔ اور آپ پکڑا گیا۔

خجستہ نے پوچھا۔ اس کی نقل کیوں کر ہے؟ بیان کر۔

توتا کہنے لگا۔ کہنے والوں نے یوں کہا ہے۔ کسی وقت میں ایک گدھا کسی بارہ سنگے سے دوستی رکھتا تھا۔ اور وے دونوں ایک ہی جنگل میں چرا کرتے تھے۔ اتفاقاً کسی رات دونوں مل کر بہار کے موسم میں کسی باغ میں چرنے گئے۔ جب پیٹ بھر چکا۔ تب بارہ سنگے سے کہنے لگا۔ بھائی! اب یہ جی چاہتا ہے کہ دل کھول کر رینگئے۔ اور سرود کیجئے۔ کیونکہ بادِ نسیم سے مغز معطر ہوا۔ اور ہوائے سرد نے دل کو سرور بخشا۔

یہ سن کر گوزن کہنے لگا کیا خوب! یہ وہی بات پیش آئی ہے کہ گدھے کو خشکا بھائے۔ اپنی فکر کر۔ اور اگر کچھ کہنا ہے تو اپنی پالان اور دھوبی کے باندھنے چھاندنے کا احوال کہہ۔ یہ کیا بکتا ہے۔ یقین جان۔ کوئی آواز تیری آواز سے بدتر نہیں۔ گدھے کو گانے سے کیا کام؟ اس باغ میں ہم تم چوری سے آ گئے ہیں۔ اگر اس وقت تو ملار گاوے گا۔ تو باغبان چونک اٹھے گا۔ اور کتنے لوگوں کو بھی پکارے گا۔ تو پھر تو آپ ہی باندھا جاوے گا اور مجھے بھی پٹوا دے گا۔ یہ بھی ویسا ہی قصہ ہوا کہ جیسا ان چوروں نے اپنی نادانی سے صدمہ اٹھایا۔ اور پکڑے گئے۔

سنا ہے کہ کسی شب کو کئی چور باہم ہو کر ایک دولت مند کے گھر چوری کرنے گئے۔ اس کے مکان دلچسپ میں ایک قرابہ شراب سے بھرا ہوا پاکر آپس میں کہنے لگے۔ اب جو ہونی ہو سو ہو۔ بالفعل اسی جگہ پر شراب پیجئے اور عیش کیجئے۔ تاکہ چوری کا بھی وقت قریب پہنچے۔ بعد اس کے اسباب موافق اپنی باربرداری کے چرائیے۔ اور گھر جا کر اس اسباب دزدی کو غنیمت سمجھئے۔

یہ بات ٹھہرا کر آدھی رات تک مے خوری کیا کیے اور خوش رہے جوں ہی نشہ میں آن کر غوغا کرنے لگے۔ اور اسباب چرانے۔ غرض عالم نشہ میں چوری کچھ کرتے تھے۔ اور باندھتے کچھ تھے۔ اتنے میں صاحب خانہ چونکا۔ اور اپنے لوگوں کو جمع کر کے ان سبھوں کو باندھا۔ دراز گوش نے کہا۔ استغفراللہ۔ تو کیا جانتا ہے۔ میں شہر کا رہنے والا ہوں۔ گانے پر مرتا ہوں۔ اور تو بے چارہ جنگلی۔ اس مزے سے کیا واقف کچھ ہو۔ میں تو گیت گاؤں گا۔ اور تجھے سننے سے کیا ہو گا۔ باوجود اس حکایت کے سننے کے گدھے نے اس کا کہنا نہ مانا۔ اور منہ آسمان کی طرف پسار کر ملار بے تال گانے لگا اتنے میں باغبان آپہنچا اور کئی شخصوں کو بلوا کر ان دونوں کو چومیچا کیا۔۔۔

توتے نے یہ کہانی تمام کر کے کہا۔ اے بانو! جو کوئی وقت کے مطابق کام نہیں کرتا۔ سو یہی دیکھتا ہے۔ بی بی! لازم ہے کہ ہر کوئی ہر ایک وقت کو دریافت کرتا رہے۔ بہتر یہی ہے۔ جا اور اپنے اس ناامید کی امید بر لا۔

خجستہ نے یہ سنتے ہی چاہا۔ کہ اپنے تئیں اس کے پاس پہنچا دے۔ اتنے میں صبح ہو گئی۔ مرغ نے بانگ دی۔ جانا اس کا اس روز بھی موقوف ہوا۔ تب یہ بیت پڑھی۔ اور رونے لگی۔

اے مہر جبیں سے میرے مجھے کیوں جلا گیا
اے صبح کینہ جو۔ یہ ستم تو نے کیا کیا

پینتیسویں کہانی

جب آفتاب چھپا اور ماہتاب نکلا۔ خجستہ یاس سے بھری ہوئی رخصت لینے توتے کے پاس گئی۔ اور کہنے لگی۔ اے توتے! میں ہر ایک شب تیرے پاس آتی ہوں۔ اور احوال اپنی بے قراری کا سناتی ہوں۔ پر تجھ نمک کا حق ادا نہیں کرتا۔ اور مجھے ٹھنڈے جی سے رخصت نہیں دیتا۔ اے وائے نصیب!

●

کہتی ہوں جناب حق میں ڈرتے ڈرتے
مدت گزری دعائیں کرتے کرتے
قدرت ہے اسی کو کہ یہ مجھ سے محروم
منہ یار کا دیکھ لیوے مرتے مرتے

اس قدر میرے دلِ ریش پر نمک مت چھڑک۔ اور اس قدر مجھ ستائی کو نہ ستا۔ لازم ہے کہ اب جلد رخصت کر۔ توتا کہنے لگا۔

اے خجستہ! آج کی شب جس طرح ہے اس طرح جا۔ اور اپنے معشوق کو گلے لگا۔

جہاں کے تو یونہیں سبھی کاروبار
دلے حاصل عمر رہے۔ وصل یار
شب و روز پی مل کے باہم شراب
مہ و مہر کو رشک سے کر کباب

اگر سوائے میرے اس احوال سے کوئی اور آگاہ ہو۔ تو تو بھی ویسی تدبیر کرنا۔ جیسی اس روم کی شہزادی نے ساتھ اس پاک دامنی کے کی تھی۔

بانو نے پوچھا۔ اس کی حکایت کیوں کر ہے؟ بیان کر۔

توتا کہنے لگا۔ ایک بادشاہ روم کی بادشاہت کے قریب رہتا تھا اتفاقاً ایک دن اس کے وزیر نے کہا۔ اے جہاں پناہ! روم کا بادشاہ ایسی ایک لڑکی خوبصورت رکھتا ہے کہ بس۔

عجب طرح کا نور ہے جاں فسزا
کہ مہ رو بہ رو جس کے ہو ٹھیکرا۔

اگر وہ اپنی بیٹی جناب عالم پناہ کو بیاہ دے۔ تو کیا خوب ہو۔ بادشاہ نے اس سخن کو وزیر کے نہایت پسند کیا۔ اور ایک ایلچی کے ہاتھ مع سوغات اس لڑکی کی طلب کا پیغام روم کے بادشاہ کو بھیجا۔ جس وقت اس نامہ بر نے یہ پیغام اس بادشاہ سے جاکر کہا۔ اسی وقت وہ ایلچی پر خفا ہوا۔ اور کہنے لگا۔ اے نامہ بر! تیرے بادشاہ نے مجھ کو کیا سمجھا؟ جو اس ڈھب کا پیغام بھیجا۔ اگر میں اپنی بانی پر آتا ہوں تو اس کی سلطنت کو خاک میں ملا دیتا ہوں تجھے کیا کہوں! چل دور ہو سامنے سے۔ بہتر یہی ہے کہ پھر ادھر منہ نہ کرنا۔ خبردار — خیر اسی میں ہے۔ وہ بچارہ اس خفگی سے تھرتھرا گیا۔ وہاں سے ناامیدانہ پھرا۔

اسے دیکھ غصّے میں وہ ڈر گیا
کہے تو کہ جیتے ہی جی مر گیا

اسی طرح پچھلے پاؤں بھاگ کر اپنے بادشاہ کے پاس آیا اور وہاں کی واردات بیان کرنے لگا۔ یہ بات بادشاہ کو نہایت ناگوار معلوم ہوئی اسی گھڑی ایک فوج قاہرہ اپنے ساتھ لے کر چڑھ گیا اور اس کے ملک کو ایک آن میں تاخت و تاراج کر دیا۔ جب وہ تنگ آیا۔ ناچار اپنی لڑکی بیاہ دی اور اس لڑکی کے پہلے خاوند سے جو ایک لڑکا ہوا تھا۔ اس کو اپنے پاس رکھا۔ اور اس لڑکی سے کہا۔ بابا۔ اپنے اگلے شوہر کا احوال اس خاوند سے مت کہنا۔ یہ کہہ کر اسے اس کے خاوند کے ساتھ رخصت کیا۔

غرض وہ بادشاہ اس شہزادی کو لے کر اپنے شہر گیا۔ اور اس سے عیش و عشرت کرنے لگا۔ بعد کئی دن کے شہزادی اپنے بیٹے کی جدائی میں بے اختیار رونے لگی۔ اور غم کرنے لگی۔ اور یہ بات جی میں ٹھہرائی کہ کوئی ایسا ذکر بادشاہ کے سامنے کیجیے۔ کہ جس کے سبب اس لڑکے کو بلوا لیجے۔ اس خیال میں تھی ہی جو اتنے میں بادشاہ نے اسے ایک ڈبا جواہر بیش قیمت سے بھرا ہوا دیا تب شہزادی نے کہا۔ کہ آپ نے سنا ہوگا کہ میرے باپ کے پاس ایک ایسا عقلمند غلام ہے۔ کہ کیا کہیے۔ چنانچہ وہ عیب و ہنر جواہر کا خوب پہچانتا ہے۔ اگر وہ اس وقت یہاں ہوتا تو اس جواہر کو دریافت کرتا۔ اور اچھا برا بتا دیتا۔

بادشاہ نے کہا۔ اگر اس غلام کو تیرے باپ سے میں مانگوں تو وہ تجھے دے یا نہ دے؟

شہزادی نے کہا۔ کہ نہ دیں کیوں کہ بابا جان نے اس کو بچپن سے اپنے فرزندوں کی طرح پرورش کیا ہے۔ اگر تم کو اس کی تمنا ہے۔ اور اسے بلوانا منظور ہے تو ایک سوداگر میں اپنی طرف سے بھیجوں؟ اور کچھ اپنی نشانی دوں۔ اور بہتری کا امیدوار اس لڑکے کو کروں تو شاید اس سبب سے جہاں پناہ بھیجیں۔ اور وہ بھی آوے۔

چنانچہ بادشاہ نے اس کے کہنے کے بموجب ایک سوداگر نہایت مالدار دانا کو واسطے تجارت کے روم کی طرف رخصت کیا۔ جس وقت وہ تاجر بادشاہ کے بموجب فرمانے کے مال و اسباب واسطے سوداگری کے لے کر چلا۔ اس وقت شہزادی نے بادشاہ سے چھپ کر اس سے کہا کہ اے سوداگر! وہ لڑکا غلام نہیں۔ میرا بیٹا ہے۔ میں اسی کے غم میں بیمار پڑتی ہوں۔ ایک سبب تھا جو میں نے بادشاہ سے کہا۔ کہ وہ میرا غلام ہے۔ تجھ کو بھی لازم ہے۔ کہ تو اس کو غلاموں کی طرح نہ لانا۔ غرض وہ سوداگر بعد کئی دن کے گیا۔ اور اس لڑکے کو بہر صورت بادشاہ سے مانگ لایا۔ اور اس بادشاہ کے حوالے کیا۔ شاہ نے جو اس لڑکے کو خوبصورت و ہنرمند پایا۔ تو نہایت خوش ہوا۔ اور اس تاجر کو ایک خلعت فاخرہ بخشا اور اس غلام کو اپنے پاس رکھا۔ اور ماں اس کی اسے دور سے دیکھ لیتی اور اس کے سلام و پیام سے اپنا جی خوش کرتی۔

اتفاقاً بادشاہ ایک دن شکار کھیلنے گیا۔ شہزادی نے فرصت پا کر اسی لڑکے کو محل میں بلوا کر اپنے گلے لگایا۔ اور اس کا سر و منہ چوما۔ اور گذشتہ غم اپنا اس سے کہا۔ یہ خبر خبرداروں نے اسی گھڑی بادشاہ کو پہنچائی۔ کہ آج شہزادی نے جہاں پناہ کے پیچھے اس غلام کو محل میں طلب کیا اور اپنے برابر بٹھایا۔ یہ خبر وحشت اثر سنتے ہی بادشاہ نہایت اپنے جی میں آزردہ ہوا۔ اور کہنے لگا۔ کہ ایسی عورت سے ڈریئے۔ کہ یہ اپنے دیدے پر دیوار بناتی ہے۔ کیا ہی مکر کر کے اپنے یار کو روم سے بلوایا۔ اللہ رے کلیجہ۔

پھر آپ جلد شکارگاہ سے محل میں داخل ہوا۔ اور ایک کرسی جواہر نگار پر متفکر ہو کر بیٹھ رہا۔ اس حالت میں شہزادی نے جو بادشاہ کو دیکھا۔ تو اپنی فہم سے دریافت کیا۔ اور کہا۔ کہ آج مزاج مبارک پر ملال معلوم ہوتا ہے یہ کیا سبب ہے؟ تب بادشاہ نے کہا۔ کہ کیا خوب۔ تم اپنے معشوق کو روم سے بلوا کر ہم بستر ہو۔ اور مجھ سے بے وفائی کرو۔ یہ کیا شوخی اور بے شرمی ہے؟ چاہتا تھا۔ کہ اسے ہلاک کرے۔ پر عاشق معشوق کو کب مار سکتا ہے؟ پھر اپنے جی میں کہنے لگا۔ کہ بی بی کے بدلے غلام کو ماریئے۔

بہ ٹھہرا کر ایک جلاد کو اشارہ کیا۔ اور کہا۔ کہ اسی گھڑی اس کے سر کو تن سے جدا کر دے۔ یہ سنتے ہی اس لڑکے کو جلاد نے پکڑا۔ اور قتل گاہ میں بٹھا کر پوچھا۔ اے اجل گرفتہ! تو نہ جانتا تھا۔ کہ یہ بادشاہ بیگم ہے۔ اس سے دوستی کرے گا تو کیونکر بچوں گا۔ اور تیرا قدم کیوں کر بڑھا جو تو محل بادشاہ میں گیا۔ اس نے کہا۔ کہ تو ایسی بات نہ کر۔ وہ میری سگی ماں ہے۔ جب میرا باپ مرا۔ تب اس نے اسے اپنا شوہر کیا۔ اور مارے شرم

کے میرا احوال اس سے نہ کہا۔ میں جھوٹ نہ بولوں گا۔ مار یا چھوڑ۔

قابو میں ہوں۔ میں تیرے گو اب جیا تو پھر کیا
خنجر تلے کس نے ٹک دم لیا۔ تو پھر کیا

اس بات کو سنتے ہی جلاد کو رحم آیا۔ اور اس کے قتل سے باز رہا۔ اور اپنے جی میں کہنے لگا۔ اگر یہ بادشاہ پر کھلے۔ کہ وہ اس کا بیٹا تھا۔ تُو نے کیوں مارا؟ اور شہزادی کی خاطر اس کو مجھ سے طلب کرے اور میں اس کو اس کے پاس جیتا نہ پہنچاؤں گا۔ تو میں بھی اسی طرح دوسرے کے ہاتھ سے مارا جاؤں گا۔

اس اندیشے کو دل میں جگہ دے کر بادشاہ سے عرض کی۔ جہاں پناہ! اس کُشتنی کو وہاں جا کر ماروں گا۔ جہاں پانی کا نام بھی نہ ہو گا۔ غرض اس بہانے سے وہ بادشاہ سے لے کر اس کو اپنے گھر پہنچا اور چھپا رکھا۔ بعد دو دن کے بادشاہ کی جناب میں آن کر عرض کی۔ عالم پناہ! اس کا سر قدم مبارک پر صدقے ہوا۔ بارے اس بات کے سنتے ہی تھوڑی سی آتش غضب بادشاہ کی دھیمی ہوئی۔ پر شہزادی کا اعتبار اٹھ گیا۔ اور اس کی کوکھ میں اور بھی حمیت کی آگ بھڑکی۔

کلیجہ پکڑ ماں تو بس رہ گئی
کلی کی طرح سے بکس رہ گئی

بے اختیار رو رو کر اپنے جی سے کہنے لگی۔ یہ کیا ہوا۔ ادھر بیٹا مرا۔ اور ادھر خاوند چھوٹا۔ قضا کار ایک دن ایک بڑھیا جو اس کے محل میں رہتی تھی۔ اس نے پوچھا۔ اے بی بی! اس جوانی پر یہ غم کس کا کھاتی ہے؟ جو اس طرح سے آٹھوں پہر مسند پر منہ ڈھانکے پڑی رہتی ہے۔ تب اس نے سارا احوال اس سے کہا۔ کہ یہ ماجرا مجھ پر گزرا۔ اس نے عرض کی اے شہزادی! تُو خاطر جمع رکھ۔ میں ایک بہانے سے تیرے بادشاہ کو تجھ پر مہربان کروں گی۔ اور محل میں لے آؤں گی۔ شہزادی نے کہا۔ اے مادر مہربان! اگر اس درد کی دوا کرے گی۔ تو میں تیرے دامن و جیب کو جواہر سے بھر دوں گی۔ آخر کار ایک دن اسی پیر زال نے بادشاہ کو تنہا دیکھ کر پوچھا۔ اے شہنشاہ! میں تجھے کچھ دنوں سے متفکر دیکھتی ہوں۔ کیوں واری جاؤں۔ خیر تو ہے۔

تجھے نت رکھے خوش میرا کردگار
تیری اس جوانی کے بڑھیا نثار

بادشاہ نے کہا۔ اے ماما نیک بخت! میں وہ درد بے درماں رکھتا ہوں کہ جس کا بیان نہیں کر سکتا۔ چنانچہ وہ درد یہ ہے۔ کہ شہزادی نے دم سے اس غلام کو بلایا۔ کہ جس پر عاشق تھی۔ اور میں نے اسے قتل کیا۔ پر شہزادی کو نہیں مار سکتا۔ کیوں کہ خدا جانے یہ بات جھوٹ ہے یا سچ۔ یہ بات سنتے ہی وہ پیر زال کہنے لگی۔ کہ میرے پاس ایک تعویذ ایسا ہے کہ وہ جس سوتے ہوئے کی چھاتی پر رکھے۔ وہ سب اپنے جی کا احوال خود بخود کہہ دے سو نقش میں تمہیں لکھ دیتی ہوں۔ تم اس کے سینے پر دھر دیکھو۔ اس کے جی میں جو ہو گا سو سب آپ سے آپ کہہ دے گی۔ بادشاہ نے کہا۔ کہ وہ تعویذ جلد لا۔ بڑھیا نے اسی گھڑی وہ تعویذ بادشاہ کو لا دیا۔ اور آپ نے تئیں شہزادی کے پاس پہنچا کر کہا۔ آج تُو سر شام ہی جھوٹ موٹ سو رہ۔ اے ملکہ! جس وقت بادشاہ تیری چھاتی پر تعویذ رکھے۔ تُو اسی وقت سوتوں کی طرح جو جو تیرا احوال ٹھیک ٹھیک ہو۔ سو سو بہ خوبی کہہ دینا۔

حاصل کلام۔ جب پہر رات گئے بادشاہ نے اس نقش کو بادشاہزادی کے سینے پر جوں ہی دھرا۔ وہیں اس نے اپنے پہلے خاوند کا۔ اور اس لڑکے کا احوال یک بہ یک کہہ دیا۔ بادشاہ نے جو یہ بات سنی۔ اسے جگا کر نہایت مہربانی کی۔ اور سینے سے لگا کر کہا۔

جانی! کس واسطے یہ راز تُو نے مجھ سے پہلے ہی نہ کہا۔ وہ گھبرا کر بولی میں نے کون سی بات چھپائی؟ بادشاہ نے کہا۔ وہ تیرا سگا بیٹا تھا تُو نے غلام کیوں بتایا؟ تب اس نے آنکھیں نیچی کر کے عرض کی۔

کہ مجھے شرم معلوم ہوتی تھی۔ کہتی تو کیوں کر کہتی؟؟

بادشاہ نے اسی گھڑی جلاد کو بلا کر کہا۔ کہ جلد اس لڑکے کو میرے پاس لے آ۔ اگر مارا ہے۔ تو اس کی گور کہاں ہے؟ بتلا! اس نے کہا۔ کہ جہاں پناہ! میں نے اسے تا حال نہیں مارا۔ وہ خدا کے فضل سے جیتا جاگتا موجود ہے یہ بات سنتے ہی بادشاہ نہایت خوش ہوا۔ اور اسی وقت لڑکے کو بلوا کر ماں کے حوالے کیا۔ اس ناامید نے لڑکے کو گود میں لے کر درگاہ الٰہی میں سجدۂ شکر ادا کیا۔

توتے نے یہ کہانی تمام کر کے کہا۔

اے بانو! اگر تجھ کو بھی کوئی مشکل پڑے۔ تو تُو بھی اسی کی طرح بیان کونا بخبر اب جا۔ اور اپنے معشوق سے مل۔

خجستہ نے یہ سنتے ہی چاہا کہ اپنے تئیں اس کے پاس پہنچا دے۔ اتنے میں پو پھٹی۔ مرغ نے بانگ دی۔ جانا اس کا اس روز بھی موقوف ہوا۔ تب یہ فرد پڑھی اور رونے لگی۔

اے سحر یہ یقین ہوا مجھ کو
وصل کی شب میں اب نہ دیکھوں گی

اتنے میں میمون شوہر اس کا سفر سے آیا۔ اور مینا کے پنجرے کو خالی دیکھ کر کہنے لگا۔ میری مینا کہاں اُڑ گئی؟

خجستہ کہنے بھی نہ پائی۔ کہ توتے نے عرض کی۔

پیر مرشد! ہماری بندگی۔ آپ ادھر تشریف لائیں۔ ہم جو کچھ کہیں اس پر دھیان لگائیں۔ احوال مینا کا اور بی بی خجستہ کا ہم سے پوچھیں۔ میمون نے کہا۔ کیا کہتا ہے کہہ؟

توتا بولا۔ مینا کو آپ کی بیگم صاحب نے گردن مروڑ کر اپنے یار کے واسطے مار ڈالا۔ اور مجھے بھی مارا چاہتی تھی۔ سو میں نے آپ کے قدم دیکھے۔ یہ وہ بچاری ان پر نثار ہوئی۔

میمون نے کہا۔ ایں! یہ کیا بکتا ہے! توتا کہنے لگا۔ مجھے اپنے پیدا کرنے والے کی قسم۔ بی بی نے ایک نوجوان یار کیا تھا۔ اسی کے واسطے وہ ماری گئی اس بات کے سنتے ہی وہ تاب نہ لا سکا۔ ایک ہی تلوار سے خجستہ کا کام تمام کیا۔ واللہ اعلم بالصواب۔ جھوٹ سچ کہنے والا جانے۔ اللہ تعالےٰ سب کی حرمت رکھے۔

بہ تاریخ بیست و ششم شہر ذی قعدہ سنہ مرقومۃ الصدر روز پنج شنبہ

بہ وقت شام بہ خوبی تمام خدا کے فضل سے یہ قصہ شیریں کلام انجام کو پہنچا۔ اور توتا کہانی اس کا نام رکھا۔

●

کہانی ہوئی ختم جب حیدری
تو ہاتف نے نام اس کا سن کر کہا
سر آہ کو کھینچ کر توتے خوب
رکھا نام: "توتا کہانی" بھلا

ظاہراً معلوم ہوتا ہے کہ ہندی میں حرف طوئے (ط) نہیں۔ اور اس احقر نے طوطی نامہ فارسی کو زبان ریختہ میں لکھا۔ اس واسطے طوطی کی طوئے (ط) کو تے (ت) سے بدل دیا۔

حیدری کی دوسری تصانیف

حیدر بخش حیدری کی سب سے پہلی کتاب کا نام ہے۔ "قصہ مہر و ماہ" یہ کتاب ۱۷۹۸ء کے شروع میں لکھی گئی۔ سن ۱۸۰۰ء میں حیدری نے "لیلے مجنوں" کے قصے کو فارسی مثنوی سے ترجمہ کیا۔ تلاش بسیار کے باوجود ان دونوں کتابوں کے اردو ترجمے نہیں مل سکے۔ اس کے بعد حیدری کی جس تصنیف کا ذکر آتا ہے وہ اس کی ایک منظوم مثنوی ہے جس کا نام "ہفت پیکر" ہے۔ فارسی کے مشہور شاعر نظامی گنجوی نے "ہفت پیکر" کے نام سے ایک فارسی مثنوی لکھی تھی۔ حیدری نے اسی نام سے اس کے جواب میں مثنوی لکھی۔

تاریخ نادری ——— یہ حیدری کا اردو ترجمہ ہے۔ جو اس نے مرزا محمد مہدی استرآبادی کی فارسی کتاب "تاریخ جہاں کشائے نادری" سے کیا۔ اسی نام کی ایک فارسی کتاب نظامی گنجوی کی فارسی تصنیف سے پانچسو برس قبل بھی لکھی گئی۔ جس میں چنگیز خان کے حالات درج ہیں۔ یہ کتاب ابن عطا ملک جوینی نے تصنیف کی تھی۔ جو ہلاکو خان کا ملازم خاص تھا۔ جس کتاب کا ترجمہ حیدری نے کیا وہ مرزا محمد مہدی استرآبادی کی تصنیف ہے جو نادر شاہ کا ملازم تھا۔ اس کتاب میں نادر شاہ کی زندگی کے حالات درج ہیں چنانچہ حیدری نے اپنے اردو ترجمے کا نام بھی "تاریخ نادری" ہی رکھا ہے۔ اس کتاب کو حیدری نے ۱۸۰۹ء میں مکمل کیا۔

"گلزار دانش" نام کی کتاب بھی حیدری کا ترجمہ ہے۔ یہ ترجمہ شیخ عنایت اللہ کی فارسی کتاب "بہار دانش" سے کیا گیا۔ شیخ عنایت اللہ نے اپنی تصنیف میں بہرور بانو اور جہاندار شاہ کے عشق و محبت کی داستان قلمبند کی ہے۔ بقول مصنف کے جیسا کہ اس نے اپنی فارسی کتاب کے شروع میں لکھا ہے کہ یہ داستان فرضی نہیں ہے بلکہ اصل واقعہ ہے جس کو اس نے فارسی میں لکھا۔

علاوہ ازیں حیدری نے کچھ مضامین بھی لکھے۔ بہت سے اقوال اور حکایات کو ایک جگہ جمع کر کے شائع بھی کیا۔ اسی کے اس مجموعے کا نام "گلدستہ حیدری" ہے۔ اس کتاب میں "لیلیٰ مجنوں" اور "مہر و ماہ" نامی کتابوں کے دیباچے بھی درج ہیں اور حیدری کی کچھ غزلیں اور قصیدے بھی چھپے ہیں ——

"گلشن ہند"۔ انیسویں صدی میں فورٹ ولیم کالج کے توسط سے اسی نام کی دو کتابیں چھپیں۔ دونوں میں اس عہد کے اردو شعرا کا تذکرہ ہے۔ پہلی کتاب ۱۸۰۰ء میں لکھی گئی۔ اس کے مؤلف حیدری تھے۔ دوسری کتاب اسی نام سے ۱۸۰۱ء میں اختتام پذیر ہوئی۔ اس کے مؤلف مرزا علی لطف تھے۔ کتاب کی تکمیل پر حیدری کا قطعہ تاریخ ملاحظہ ہو۔

مرتب کر چکا جب تذکرہ میں   زرو سے حق یہ بولے شیخ اور رند
کہی تاریخ اس کی حیدری خوب   اسے کہتا ہے ہر یک "گلشن ہند"

۱۲۰۶
۸
۱۲۱۴ھ

اسی طرح مرزا علی لطف نے بھی اپنے تالیف شدہ تذکرے کے ختم ہونے پر اس کی تاریخ یوں کہی۔

ہر ایک گلشن ہمیشہ بہار اس حدیقہ کا   کہتا ہے یوں خزاں سے کہ کیا تو بہشت ہے
جبران پھر سے ہے بے کر دیا ہمیں اور سنئے   تاریخ اس کی جب ہے کہ رشک بہشت ہے

۱۲۲۷
۱۲
۱۲۱۵

حیدری کی کتاب "گلشن ہند" کہیں نہیں ملتی۔ ہاں البتہ برٹش میوزیم لندن میں اس کتاب کا ایک نسخہ ضرور پڑا ہے۔ مگر یہ نسخہ بھی مکمل نہیں ہے۔ مولوی سید محمد صاحب نے "ارباب نثر اردو" میں اس کتاب کا ایک ٹکڑا نقل کر دیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

"احوال مؤلف۔ اس احقر نے موافق اپنی محنت و مشقت کے چھ سات برس میں ان بزرگوں کے نام مع اشعار و تخلص کے جمع کیے اور کئی جزو بخوبی تمام لکھے۔ افسوس ہے کہ دو جزو حرف شین سے حرف ی تک خدا جانے کیا ہوئے۔ اس واسطے نوبت تحریر حرف ی تک نہ پہنچی۔ انشاءاللہ اگر زمانہ اسی صورت سے قدرے رفاقت کرتا رہا تو یہ خاکسار پھر نئے سرے سے احوال ان شعرا کا خاطر خواہ لکھتا ہے اور یہ جلد دو چار جزو کی جو کلام و ابیات سے تیار ہوئی سو دستگیری سے منشی میر بہادر علی صاحب قبلہ دام اقبالہٗ کی کہ وہ دستگیر درماندگان اور حامی بے کساں ہے اللہ تعالےٰ دنیا میں خوش و خرم رکھے اور مشکل کشائی اس کی مشکل کشا کیا کرے بہ حق محمد و آلہ الامجاد"

حیدر بخش حیدری کی آخری کتاب "گل مغفرت" کو کہا گیا ہے۔ یہ کتاب ملا حسین واعظ کاشفی کی کتاب "روضۃ الشہدا" کی اردو تالیف ہے۔ جس میں شہیدان کربلا کے حالات اور واقعات درج ہیں۔ یہ کتاب ۱۸۱۲ء میں تالیف ہوئی۔ اس کتاب کا فرانسیسی زبان میں ترجمہ [illegible] میں کسی فرانسیسی نے کیا تھا "گل مغفرت" اب کہیں نہیں ملتی۔ کتاب "ارباب نثر اردو" میں اس کتاب کا ایک اقتباس درج ہے۔ جسے ہم یہاں نقل کر رہے ہیں۔

"کتاب ایوان الرضا میں یوں لکھا ہے کہ اے اہل بیت رسالت سے ہوا خواہو اے اہل عبا کے ماتم دارو، ماہ محرم میں گریہ زاری کرو

خوشی و خرمی کو دل میں راہ نہ دو۔ حق تعالےٰ اس رونے اور غم کرنے کا اجرِ عظیم دے گا۔ بہشتِ بریں سا مکان عطا فرمائے گا۔ کہتے ہیں کہ عمرو بن لیث خراسان کے بادشاہ کا ہمیشہ سے معمول و دستور تھا کہ جب کوئی امیر سو سوار مکمل و مسلح اپنے ساتھ لاکر موجودات دیتا۔ ایک گرزِ طلائی سے سرفراز ہوتا۔ ایک دن اس کے لشکر کی نظر ثانی ہوئی۔ ایک سو چوبیس سردار صاحب گرز شمار کیے گئے۔ عمر بن لیث اس فوج کو دیکھ کر یہاں تک رویا کہ غش کھا گیا۔ جب ہوش میں آیا۔ ایک وزیر نے ہاتھ جوڑ کر پوچھا۔

"اے بادشاہ تجھے کیا ہوگیا؟ ایسا کیا حادثہ تجھ پر پڑا؟ اس نے کہا کہ اے وزیر نیک تدبیر۔ یہ نوج دریا موج دیکھ کر میں نے جناب امام حسین علیہ السلام کو یاد کیا اور جی میں یہ گزرا کہ اگر اس لشکر فتح پیکر سے جناب سید الشہدا اونکے ساتھ کربلائے معلیٰ میں ہوتا تو ان کافروں بدنہادوں کو مارتا۔ آپ کے ساتھ فتح و نصرت سے پھرتا۔ حاصل کلام وہ نیک انجام بعد تھوڑے دنوں کے مرگیا۔ شب کے وقت کسی شخص نے اسے خواب میں دیکھا کہ ایک تاج مرصع سر پر دھرے خلعت شاہانہ پہنے اکار چوبی پٹکا کمر میں باندھے ہوئے۔ حور و غلمان اپنے ساتھ لیے ہوئے ایک اسپ خوش خرام پہ سوار ہے اور بہشت بریں کی سیر کرتا پھرتا ہے۔ پوچھا۔ اس نے کہا کہ اے شخص پہلے میں غضب الٰہی میں شکار ہوا تھا۔ بعد اس کے حضرت امام حسین علیہ السلام کا غم والم یاد کرنے اور آپ کے حال زار پر رونے کے صدقے سے بخشا گیا۔ یقین ہے جو کوئی آپ کے ماتم میں شریک ہوگا اور آپ کے رنج والم کو یاد کرکے روئے گا۔ یہ گریہ وزاری حشر کے دن اس کے کام آوے گی۔ موجب نجات کا ہوگا۔"

میر شیر علی افسوس

حالات اور تخلیقات

میر شیر علی افسوس کے آبا و اجداد ہندوستان کے صوبہ آگرہ کے ایک قصبہ نارنول میں آکر آباد ہوئے تھے۔ افسوس کے والد کا نام سید علی مظفر خان تھا۔ سید علی مظفر خان کے والد یعنی افسوس کے دادا محمد شاہ کے زمانے میں دہلی آئے تھے اور انہوں نے اسی شہر میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ میر شیر علی افسوس کی پیدائش بھی دہلی شہر میں ہوئی ——— حامد حسن قادری صاحب اپنی کتاب "داستان تاریخ اردو" میں میر شیر علی افسوس کا تذکرہ کرتے ہوئے یوں رقم طراز ہیں۔

"دہلی میں میر شیر علی افسوس کے والد نواب عمدۃ الملک کے ملازم تھے۔ ۱۷۴۶ء میں عمدۃ الملک کا انتقال ہوا تو اس کی جگہ افسوس کے چچا غلام علی خان الہ آباد کے صوبہ دار مقرر ہوئے۔ محمد شاہ کے بعد سلطنت کا انتظام ابتر ہوگیا۔ اور غلام علی خان نے بھی وفات پائی تو میر شیر علی افسوس کے والد صاحب پٹنہ چلے گئے اور وہاں میر قاسم نواب بنگالہ کے داروغہ توپ خانہ ہو گئے۔ میر قاسم کے بعد اس کے بیٹے میر جعفر کے ہاں ۱۷۶۰ء تک ملازم رہے۔ وہاں سے لکھنؤ گئے اور نواب شجاع الدولہ بادشاہ اودھ کے ہاں تین سو روپیہ پر ملازم ہوگئے۔ افسوس بنگال میں باپ کے ساتھ تھے اور لڑکپن کا زمانہ تھا گیارہ برس کا سن تھا۔ اس وقت سے شعر گوئی شروع کردی تھی۔ لکھنؤ آئے تو یہاں میر و سودا۔ جرأت و انشا کی سخن سنجیوں کی دھوم تھی۔ افسوس نے بھی شاعری کی مشق کی اور اساتذہ سے داد سخن لی۔ میر حیدر علی حیران دہلوی کے شاگرد تھے۔

شہزادہ مرزا جواں بخت جہاندار شاہ (ولی عہد سلطنت مغلیہ) اس زمانے میں لکھنؤ میں تھے۔ انہوں نے افسوس کا کلام پسند کیا اور اپنا مصاحبِ شاعر بنا لیا۔ شہزادہ کے لکھنؤ سے واپس دہلی جانے کے بعد بھی افسوس لکھنؤ میں رہے۔ سرفراز الدولہ ان کی سرپرستی کرتے رہے۔ جب فورٹ ولیم کالج میں منشیوں کی ضرورت محسوس ہوئی تو سرفراز الدولہ نے لکھنؤ کے ریذیڈنٹ کرنل اسکاٹ سے افسوس کی سفارش کرکے اسے کلکتہ بھجوا دیا وہاں ۱۸۰۱ء میں پہنچے۔ ڈاکٹر گل کرائیسٹ نے دو سو روپیہ ماہوار تنخواہ پر ملازم رکھ لیا۔ ۱۸۰۹ء میں افسوس نے انتقال کیا۔

"باغ اردو" ——— جس زمانے میں میر شیر علی افسوس فورٹ ولیم کالج میں ملازم ہوئے تو انھوں نے سب سے پہلی اردو کی کتاب جو مرتب کی اس کا نام "باغ اردو" ہے۔ یہ کتاب گلستان سعدی کی فارسی کہانیوں کا اردو ترجمہ ہے۔ افسوس خود اس کتاب کے دیباچے میں یوں لکھتے ہیں۔

"تعلق میرا جو مدرسۂ ہندی (یعنی فورٹ ولیم کالج) سے ہوا۔ بنا برین اس کے بسا اوقات خدمت میں صاحب عالی طبیعت والا فطنت مدرس ہندی مسٹر جان گل کرائسٹ صاحب دام ثروتہ کے جامع قوانین اس زبان کے میں حاضر ہونے لگا۔ ایک دن صاحب موصوف نے مہربانی سے فرمایا کہ گلستان سعدی شیرازی کا زبان اردو میں ترجمہ کر۔ میں نے دھیان کیا۔ عبارت اس کی بہ ظاہر صاف و بہ باطن پیچدار ہے۔ علاوہ اس کے عبارت کا اختلاف بے شمار ہے اور ابتدا میں قوت تالیف اور شیخ مرحوم کی تصنیف کا جو خیال کیا تو کسی طرح کی نسبت نہ پائی۔

مصرع۔ چہ نسبت خاک را بہ عالم پاک

بارے فضل ایزدی اور لطف سرمدی سے تمام کتاب زبان اردو میں لکھی اور وہ مقبول خاص و عام ہوئی۔ نام اسی کا "باغ اردو" رکھا۔ چنانچہ اس کی شروع کی تاریخ بھی اسی میں نکلتی ہے۔ قطعہ

میں تاریخ اس کی جو چاہا مع نام   کہوں دل کھول با آئین نیکو
کہ اس میں ہاتفِ غیبی یہ بولا   کہ ہے آغازِ اردو باغِ اردو

۱۲۱۴ھ
۱

۱۲۱۵ھ

"باغ اردو" کے دیباچے میں افسوس نے نثر میں حمد و نعت بھی لکھی ہے

اس کی عبارت ملاحظہ ہو۔

"تازگی گلستان سخن کی، حمد باغبان حقیقی کی ہے کہ اس نے بوستان عالم کو طرح طرح کے درختوں سے آرائش دی۔ اور رنگ برنگ پھولوں سے زینت بخشی اور اس کے ابر رحمت کی بارش سے ہر ایک گل تر و تازہ نسیم فیض سے اس کے ہر ایک درخت ہرا بھرا، ہر گل کی زبان وا ہے اس کے ذکر سے ——— جو غنچہ سر بہ جیب ہے اس کی فکر میں ہے۔ قمری اسی کے طوق بندگی میں اسیر، تذرو اسی کے بند عشق سے پابہ زنجیر۔۔۔"

حامد حسین قادری اپنی کتاب داستان تاریخ اردو میں افسوس کے اس ترجمے پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"اس کی عبارت سادہ ہے۔ تاہم حیدر بخش حیدری کے مقابلے میں زیادہ اور میر امن کے مقابلے میں بہت زیادہ عربی و فارسی کے الفاظ۔۔ اضافتیں، بندشیں، افسوس کے قلم سے نکلتی ہیں۔ لفظوں کی تقدیم و تاخیر اوروں سے زیادہ نہیں ہے۔ گلستان سعدی کا ترجمہ افسوس نے اکثر لفظی کیا ہے اور لفظی ترجمہ کی کوشش میں کہیں کہیں اپنی بول چال اور روزمرہ سے بھی ہٹ گئے ہیں۔ بعض مقامات پر گلستان ہی کے الفاظ بجنسہ اپنے ترجمے میں اختیار کر لیے ہیں۔ حالانکہ ان کا بدل سہل تر الفاظ سے ممکن تھا۔ مثلاً ایک ترجمہ یہ ہے۔

"ایک بزرگ سے طینت صاحبانِ صفا کی پوچھی۔ کہا۔ ان سے ادنیٰ فعل ان کا مقدم رکھنا ہے۔ یاروں کے دل کی مراد کو اپنے مقصدوں پر اور حکیموں نے کہا ہے۔ وہ بھائی کہ اپنے ہی بند و بست میں رہے، نہ وہ بھائی ہے نہ اپنا۔" لیکن دانشمندی یہ کی ہے کہ سعدی کے وہ مقولے اور مصرعے جو ضرب المثل بن گئے ہیں ویسے ہی لے لیے ہیں۔ مثلاً"۔

ہر کسے را کہ پارسا بینی   پارسا دان و مرد نیک انگار
در ندانی کہ در نہانش چیست   محتسب را درونِ خانہ چہ کار

(ترجمہ)

جس کو ظاہر میں متقی دیکھے   اس کے تقوے کا تو نہ کر انکار
کھوج مت کر کسی کے باطن کی   محتسب را درون خانہ چہ کار

اور پھر "باغ اردو" میں ایک حکایت کا ترجمہ یوں ہے۔

"ایک فقیر کو میں نے سنا کہ فاقہ کی آگ میں جلتا، پیوند پہ پیوند گانٹھتا اور تسلی اپنی خاطر کی ان دو بیتوں سے کرتا ہے

لباس فقر و نان خشک پر میں   یہ لازم ہے کہ کر بیٹھوں قناعت
ہر ایک کی منتوں کا بوجھ اٹھانا   ہے بہتر یا کہ اپنا بار محنت

کسی نے کہا اس سے، کیا بیٹھا تو، فلانا شخص اس شہر میں ایسا صاحب ہمت ہے کہ دستِ کرم اپنا اس نے کھول دیا ہے۔ اور اپنی کمر کو آزادوں کی خدمت کے لیے باندھ لیا ہے۔ اگر صورت حال پر تیری اطلاع پاوے تو اپنے پر منت رکھے اور تیری خدمت کرنی غنیمت جانے۔ کہا اس نے، چپ رہ، فقیری میں مرنا اچھا ہے کہ حاجت کسی کے آگے لیجانا چنانچہ کہہ گئے ہیں ———

پیوند گانٹھ، صبر کا کو نہ کر اختیار   پر اغنیاء سے کر نہیں جامے کی التجا
مثل عذاب نار ہے ہمسایہ کے سبب   جانا ترا جو گلشن فردوس میں ہرا

ایک اور حکایت کا ترجمہ یوں ہے۔

"کہتے ہیں کہ نوشیروان عادل کے واسطے شکار گاہ میں ایک شکار کے کباب بھونتے تھے۔ نمک موجود نہ تھا۔ لوگوں نے زمیندار کے پاس آدمی بھیجا کہ نمک لے آوے۔ نوشیروان بولا کہ نمک قیمت دے کر لیجیو تاکہ رسم نہ بگڑ جائے اور گاؤں خراب نہ ہو۔ لوگ بولے اے بادشاہ اتنی سی بات سے کیا خلل پیدا ہوگا۔ نوشیروان بولا۔ اولاً ظلم کی بنیاد تھوڑی ہی تھی جو آیا اسی پہ بڑھاتا گیا۔ حتیٰ کہ اس درجہ کو پہنچ گیا ———

نہیں رہتا ہے ظالم بدشعار   سراپست لعنت رہے پائیدار

قطعہ

جو کھائے شاہ رعیت کے باغ سے ایک سیب
غلام اس کے درختوں سے ڈالیں جڑ سے اکھاڑ
جو آدھے انڈے پہ سلطان ستم روا رکھے
سپاہی سیخ پہ بھونیں ہزار مرغ پچھاڑ

• • •

میرزا علی لطف

حالات ونگارشات

مرزا علی لطف کے والد کا نام کاظم بیگ خان استرآبادی تھا۔ جو ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ کے حملے کے ساتھ ہی دہلی آ گئے تھے۔ اور خود بھی شاعر تھے اور ہجری تخلص کرتے تھے۔ نواب آصف الدولہ وزیر اودھ کے دادا یعنی ابو المنصور خان صفدر جنگ کی وساطت سے بادشاہ دہلی محمد شاہ کے دربار میں رسائی حاصل ہوئی شعر فارسی میں کہتے تھے۔ مرزا علی لطف کو بھی فارسی میں اپنے باپ سے تلمذ تھا۔ انہوں نے دہلی میں تعلیم حاصل کی۔ اسی شہر میں پروان چڑھ کر بڑے ہوئے اسی شہر کی ادب دوست اور شعر و سخن کی متوالی فضاؤں میں شعر و شاعری شروع کی۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے۔ سودا اور میر تقی سے اردو میں مشورہ سخن لیا۔

دہلی کی بربادی کے بعد میرزا لطف علی وہاں سے نکل کھڑے ہوئے ان کا ارادہ حیدر آباد جانے کا تھا مگر سب سے پہلے لکھنؤ آئے۔ یہاں اساتذۂ فن مشق سخن میں مصروف تھے۔ انشا اور جرأت کا میدان گرم تھا۔۔۔ شہزادہ مرزا جواں بخت بھی اسی شہر حسیناں میں تھے۔ انہوں نے لطف کی حوصلہ افزائی کی۔ لیکن لطف کا وہاں جی نہ لگا اور وہ وہاں سے نکل کر سیدھے پٹنے پہنچے۔ یہاں بھی جی نہ لگا تو سوچا کہ کلکتے کا رخ کیا جائے۔ مگر وہاں فورٹ ولیم کالج کے ڈاکٹر گل کرائسٹ سے ملاقات ہو گئی۔ انہوں نے لطف سے کہا کہ وہ تذکرہ لکھیں۔ لطف اس کتاب کے دیباچے میں لکھتے ہیں ———

"علی ابراہیم خان مرحوم نے ایک تذکرہ شعرائے ہند کا عبارت فارسی میں لکھا ہے اور نام اس کا "گلزار ابراہیم" رکھا ہے۔ ۱۱۹۸ھ اور

۱۷۸۴ء میں وہ تذکرہ تمام ہوا۔ مشہور یوں ہے کہ بارہ برس میں سرانجام ہوا۔ رفتہ رفتہ حسب سر حلقہ بزم نکتہ دانی، رونق افزائے محفل معانی، سخن کی جان اور سخنداںوں کے قدر دان، صاحب والا مناقب، مسٹر گلکرسٹ صاحب کی نظر مبارک سے گزرا۔ از بسکہ شاعروں کا حال اس میں مجمل لکھا تھا۔ ایک مدت سے صاحب عالی حوصلہ کو خیال اس بات کا تھا کہ اگر بیان اس کا تفصیل کے ساتھ زبان ریختہ میں کیا جائے تو خوب ہو۔ اور ہر ایک شاعر کی پوری پوری غزل اپنا جلوہ دکھائے تو نہایت طبع کے مرغوب ہو، مبتدی اس سے بڑا مزا پائیں گے اور نو مشق کیف بہت اٹھائیں گے۔

چنانچہ اس خیر خواہ جلی وخفی میرزا علی کو کہ لطف تخلص کرتا ہے۔ نہایت محبت اور اخلاق سے فرمایا کہ تو اگر تن دہی اس مقصد میں کرے تو ہم اس تذکرے کو اپنی طرز پر لکھیں۔ اگرچہ یہ پابند الفت کا اس ایام میں ارادہ حیدر آباد کی سیر کا رکھتا تھا۔ لیکن اس خلق مجسم کے اخلاق کا کیا بیان کروں کہ اس مضمون کو اس وقت اس خوبی سے ادا فرمایا کہ مجھ سے سوائے اس بات کے اور کچھ بن نہ آیا کہ میں لاکھ جان سے حاضر ہوں اور ایک سر مو آپ کے فرمانے سے نہیں باہر ہوں۔

الحمد اللہ آج کے دن تک کہ (۱۲۱۵ھ) بارہ سو پندرہ ہجری اور اٹھارہ سو ایک مطابق عیسوی کے ہیں۔ موافق حکم اس صاحب والا مناقب کے کہ نام نامی اور اسم گرامی اس کا اوپر مذکور ہوا ہے اسلم ہیچ مداں نے یہ تذکرہ لکھا اور نام اس کا بموجب ارشاد اس صاحب ممدوح کے "گلشن ہند" رکھا۔

نمونۂ نثر علی لطف۔ میر تقی میر کے بارے میں یوں لکھتے ہیں۔

"نا قدر دانی سے اغنیا کی اور نا سمجھی سے اہل دنیا کی اب بازار سخن سازی اس درجہ کا ہے اور ہوائے شہرستان معنی طراز اس مرتبہ ناسد کہ میر سا شاعر جو کہ سحر کاری سخن میں طلسم ساز ہے خیال کا اور جادو طرازی بیان میں معانی پرداز ہے مقال کا، وہ نان شبینہ کا محتاج ہے اور بات کوئی نہیں پوچھتا اس کی آج ہے"۔

حیراں کے بارے میں یوں فرماتے ہیں۔

"حیران تخلص، میر حیدر علی نام، ساکن شاہ جہان آباد کے، شاگرد رائے سرپ سنگھ دیوانہ تخلص استاد کے"۔

غرض یوں طرز تحریر الجھا ہوا مقفیٰ ہے اور عربی فارسی کی ترکیبوں میں الجھا ہوا ہے۔ چنانچہ مولانا شبلی اوپر والے جملے کے بارے میں یوں شکایت کرتے ہیں۔

"اس فقرہ میں قافیہ کی پابندی سے سخت تعقید پیدا ہو گئی ہے۔ ان کا مطلب یہ ہے کہ سرپ سنگھ جن کا تخلص دیوانہ ہے اور جو استاد فن ہیں، حیراں ان کے شاگرد تھے"۔

حیدر آباد پہنچ کر لطف کو قدرے سکون ملا۔ تذکرہ شعرائے ہند کو وہ ختم کر چکے تھے۔ حیدر آباد میں اعظم الامرا ارسطو جاہ نے جو کہ اس وقت مدار المہام تھے ان کی بڑی ہمت افزائی اور سرپرستی کی اور ان کا ڈیڑھ صد روپیہ ماہوار وظیفہ مقرر کر دیا گیا۔ چنانچہ اسی شہر میں لطف نے ۱۸۲۲ء میں انتقال کیا۔

جناب حامد قادری صاحب لکھتے ہیں۔

"تذکرۂ گلشن ہند نایاب و ناپید تھا۔ اتفاق سے ۱۹۰۲ء میں حیدر آباد کی موسیٰ ندی میں عظیم الشان سیلاب آگیا۔ صدہا گھر ویران ہو گئے اور لوگوں کا اسباب بہہ گیا۔ اسی میں یہ تذکرہ کسی کے ہاتھ آگیا۔ مولانا شبلی حیدر آباد میں تھے ان کو دکھایا۔ انہوں نے بہت پسند کیا۔ اور خود اس پر تشریح و حواشی لکھے۔ مولوی عبد الحق صاحب سیکرٹری انجمن ترقی اردو نے مفصل عالمانہ مقدمہ لکھا۔ اور ۱۹۰۶ء میں پہلی مرتبہ شائع ہوا۔ بعد کو دوبارہ انجمن نے اپنی طرف سے گلشن ہند اور اس کے ماخذ اصل "گلزار ابراہیم" دونوں کو ایک جگہ شائع کیا۔

داستان تاریخ اردو

میر بہادر علی حسینی

حالات میر بہادر علی حسینی کے والد ماجد دہلی میں رہتے تھے اور ان کا نام سید عبد اللہ کاظم تھا۔ وہ حضرت شاہ عبد القادر صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے حلقۂ ارادت میں تھے اور قرآن حکیم کا اردو ترجمہ ان ہی کے اہتمام سے پہلی بار دہلی میں شائع ہوا۔۔ میر بہادر علی حسینی فورٹ ولیم کالج میں میر منشی تھے۔ ان کی سفارش سے ہی میر امن کا کالج میں تقرر ہوا تھا۔

نمونۂ نثر میر علی بہادر حسینی نے فورٹ ولیم کالج میں رہتے ہوئے چار کتابیں تالیف کیں اور مرتب بھی کیں۔ (۱) نثر بے نظیر (۲) اخلاق ہندی (۳) تاریخ آسام (۴) رسالہ گل کرسٹ۔ اب ہم تھوڑا تھوڑا احوال ان کتابوں کے بارے میں رقم کرتے ہیں۔

نثر بے نظیر میر حسن کی مثنوی بے نظیر و بدر منیر کو نثر میں تالیف کیا گیا ہے۔ اصل مثنوی ساری کی ساری نظم میں ہے اور اپنے اسلوب اور لطف بیان کے اعتبار سے نمایاں حیثیت رکھتی ہے۔ حسینی نے اسے اردو نثر میں آسان کر کے لکھا ہے۔ جو اگرچہ میر حسن کے حسن بیان تک تو ہرگز نہیں پہنچتی۔ مگر حسینی نے نثر کو زیادہ شگفتہ اور پُراثر بنانے کے لیے جگہ جگہ اصل مثنوی میں سے اشعار کو نقل کر دیا ہے جس سے مثنوی کی اصل روح اور دلچسپی برقرار رہی۔ میر حسن کی یہ مثنوی بے نظیر و بدر منیر فورٹ ولیم کالج کے نصاب تعلیم میں بھی شامل تھی۔ گل کرائسٹ کے حکم سے اصل مثنوی کے ساتھ ہی حسینی کی نثر میں لکھی گئی کتاب بھی شائع ہوئی۔ اس کتاب کا انگریزی میں ترجمہ ۱۸۷۱ء میں ایک صاحب ایم ایچ کورٹ نے شائع کیا تھا۔

میر بہادر علی حسینی اپنی کتاب کے دیباچے میں لکھتے ہیں۔

"قصہ بے نظیر و بدر منیر کہ نظم میں تصنیف کیا ہوا شاعر بے ہمتا ادا بند یکتا، رونق بزم سخن میر حسن مرحوم متخلص بہ حسن، سعید ازلی خلف الرشید میر غلام حسین ضاحک دہلوی کا تھا۔ فی الواقع ہر ایک مصرعہ اس کا فصاحت و بلاغت میں بے نظیر ہے اور ہر ایک شعر حسن و خوبی میں مثل بدر منیر، جو سخن

دان منصف مزاج عاشق پیشہ ہیں۔ وہی اس کی طرز بخوبی پہچانتے ہیں مقابل اس کے نظم کس سے ہو سکے، بلکہ کوئی رمزوں کو پا تو سکے؛ قاصر ہے زبان اس کی توصیف میں، ہر کہ و مہ مشغول ہے اس کی تعریف میں۔ اب کہ اس کو عہد میں شاہ عالم بادشاہ کے اور ریاست امیر سراپا تدبیر مارکوئس ولزلی گورنر جنرل بہادر دام اقبالہٗ کے ۱۲۱۷ھ مطابق ۱۸۰۲ء کے حکم سے صاحب خداوند نعمت۔ جان گل کرائسٹ صاحب بہادر دام حشمتہٗ کے خاص میر بہادر علی حسینی نے شروع قصہ سے موافق محاورہ خاص کے نثر میں لکھا ہے۔ پہلے اس سے یہ خاکسار اس کہانی کو خاص و عام کی بول چال کے مطابق بہ طرز سہل واسطے صاحبان نو آموز کے تحریر کر چکا تھا۔ اب جی میں یوں آئی کہ اس داستان شیریں کو کہ فی الحقیقت قصۂ شیریں سے شیریں تر ہے اس طرح سے نثر کروں کہ ہر ایک زبان دان شاعر اس کو سن کر عش عش کرے، اور یہ اسم ہیچ مداں کی ایک یادگاری اس دنیا میں رہے۔"

دیباچہ نثر بے نظیر

یہ کتاب بھی نایاب ہے۔ اس کی کوئی نقل ہندوستان اور پاکستان میں دستیاب نہیں ہے۔ مؤلف "ارباب نثر اردو" نے بڑی تگ و دو کے بعد کہیں سے نثر بے نظیر کا کوئی نسخہ حاصل کیا — یہ نسخہ مطبوعہ کالج پریس کا ہے اور ۱۸۰۳ء میں چھپا تھا۔ اس نسخے سے نثر بے نظیر کی نثر کا ایک ٹکڑا ملاحظہ ہو۔ اس جگہ "داستان سواری کی تیاری" کا نقشہ ہے۔

"جب گیارہ برس خیریت سے گزر گئے، بارھواں برس آیا، الحمد للہ جس دن کی آرزو تھی سو کریم نے ساتھ خوشی کے دکھایا۔ شادی محل میں چاروں طرف دھوم مچ گئی۔ مبارکبادی کی صدا پھر بلند ہوئی۔" نظم۔

پڑی جب گرہ بارھویں سال کی　　کھلی گل جھڑی غم کے جنجال کی

چار گھڑی دن رہے عرض بیگی کو بادشاہ نے ارشاد کیا کہ صبح سواری مبارک جلوس سے تیار ہو کر میں شہزادے کو لے کر سوار ہوں گا، تا رعیت اور سپاہ اس کا دیدار دیکھ کر شاد ہو، اور بستی ان کے دل کی آباد ہو، تم نقیبوں کو تاکید کر دو گھر گھر یہ حکم پہنچا دیں اور ہر ایک چھوٹے بڑے کو جتا دیں کہ زرق برق سے نکلے اور تمام اسباب سواری کا بھی نیا اور جگمگاتا ہو، خبردار ایک سوار میلا اور گھوڑے کا زین پرانا نظر نہ آوے۔ احیاناً کسی کو اس وقت اگر کوئی چیز میسر نہ آوے تو سرکار سے بے تکلف لیوے کہ ما بدولت کی مرضی اور خوشی اسی میں ہے۔ نظم۔

کریں شہر کو مل کے آئینہ بند　　سواری کا ہو نور جس سے دو چند

اتنے میں شام پڑی۔ آفتاب والشمس پڑھ کے سجدۂ شکر میں گیا۔ مہتاب سورۂ نور پڑھتا ہوا نکلا۔ حضرت محل میں تشریف لے گئے، تمام رات ناچ رنگ رہا۔ مارے خوشی کے محل میں کوئی نہ سویا۔

عجب شب تھی وہ جوں سحر رو سفید　　عجب روز تھا شکلِ روزِ امید

القصہ رات آخر ہوئی۔ چاند نے بالین استراحت پر اپنا سر رکھ دیا اور خورشید بڑی چمک سے آنکھیں ملتا ہوا اٹھا۔

کہا شاہ نے اپنے فرزند کو　　کہ بابا نہا دھو کر تیار ہو

اخلاق ہندی — یہ کتاب بھی سنسکرت کی کتاب کا ترجمہ ہے سنسکرت میں لکھی گئی کہانیاں بڑی قدیم ہیں اور ان کا تعلق انسان کے اخلاقیات اور معاشرے کی عام برائیوں سے ہے۔ سب سے پہلے اس کتاب کے ترجمے فارسی زبان میں ہوئے اور مفرح القلوب اور نگار دانش کے نام سے مشہور ہوئے میر بہادر علی حسینی نے اس کا ترجمہ فارسی سے اردو میں کیا۔ یہ ترجمہ بھی حسینی نے فورٹ ولیم کالج کے ڈاکٹر جان گل کرائسٹ کی فرمائش پر ۱۸۰۲ء میں کیا اور اس کا نام اخلاق ہندی رکھا۔ یہ کتاب سب سے پہلے ۱۸۰۳ء میں کلکتہ سے شائع ہوئی۔ دیباچے میں حسینی رقم طراز ہیں۔

"یہ کتاب سرکار دولت مدار میں ملک الملوک شاہ نصیر الدین کے جس کی تختگاہ صوبہ بہار تھی پہنچی۔ جب انہوں نے سنا اس میں قصے از بسکہ دلچسپ ہیں اور نصیحت میں نہایت مرغوب، اور باتیں خوب اور حکایتیں اکثر مفید، تب اپنے ملازموں سے ایک کی طرف مخاطب ہو کے فرمایا کہ اس کو ترجمہ سلیس فارسی میں کر دو تو میں اپنے مطالعہ میں رکھوں اور اس کے مضمون سے مستفید ہوں۔ تب ان میں سے ایک شخص مفتی تاج الدین نے حکم بجا لایا اور اس کا نام مفرح القلوب رکھا۔"

نمونہ نثر اخلاق ہندی۔

"سانپ ہر روز دو تین مینڈک کھانے لگا۔ تھوڑے دنوں میں سب کو نگل گیا۔ اکیلا بادشاہ رہا۔ سانپ نے پوچھا۔ اے بادشاہ! آج میں کیا کھاؤں! مجھے بھوک لگی ہے۔ مینڈک نے کہا۔ اے سانپ کسی جھیل کے کنارے چل کر اپنا پیٹ بھر لے۔ تب اس نے کہا۔ تمہارے لشکر نے میرے پیٹ میں چھاؤنی کی ہے۔ بادشاہ کو لشکر سے جدا رہنا ٹھیک نہیں۔ اپنی فوج کے ساتھ آپ بھی اسی چھاؤنی میں داخل ہوں تو بہتر ہے۔ تب وہ اپنی موت سمجھ کر چپ ہو رہا۔ سانپ نے اپنے شہسوار کو زمین پر ٹپک کر کوڑے دم کے مارے اور کھا گیا۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے۔

گردن بندگی نت خم پر در فرماں پر
گوے سر اپنا فدا کیوں نہ کرے چوگاں پر

تاریخ آسام اس کتاب میں شہنشاہ اورنگ زیب کے ایک سپہ سالار میر جملہ کی آسام پر حملے کی مہم کے حالات درج ہیں۔ یہ مہم ۱۰۷۰ھ میں شروع ہوئی تھی۔ اسے شہاب الدین طالش ابن ولی محمد نے فارسی زبان میں لکھا تھا۔ میر بہادر علی حسینی نے اس کتاب کو اردو زبان میں ترجمہ کیا یہ ترجمہ بقول فرانسیسی مستشرق گارساں دتاسی ۱۸۰۵ء میں چھپا۔

رسالہ گل کرائسٹ فورٹ ولیم کالج کے جان گل کرائسٹ نے اردو صرف و نحو پر ایک کتاب لکھی تھی جو کہ بڑی ضخیم کتاب تھی اور کالج کے نصاب تعلیم میں شامل تھی۔ حسینی نے اس ضخیم کتاب کو مختصر کر کے بیان کیا ہے۔ یہ رسالہ سب سے پہلی بار کلکتہ سے ۱۸۱۶ء میں شائع ہوا۔ حسینی کی بعض دوسری کتابوں کی طرح یہ کتاب بھی نہیں ملتی۔

مظہر علی خان ولا

حالات و تخلیقات مظہر علی خان ولا کا ذکر ہم اس سے پہلے میر امن کے

باب میں کر چکے ہیں۔ وِلا خاص دہلی کے باشندے تھے۔ یہیں پیدا ہوئے اسی شہر میں پلے بڑھے اور تعلیم حاصل کی۔ ان کا نام مرزا لطف علی تھا لیکن ان کی شہرت مظہر علی خاں کے نام سے ہوئی۔ وِلا کے والد کا نام سلیمان علی خاں تھا۔ جو کہ فارسی میں بھی شعر کہتے تھے۔ مظہر علی خاں وِلا کے دادا کا نام محمد حسین علی قلی خان تھا۔ نام تو محمد حسین تھا مگر وہ علی قلی خان کے خطاب سے زیادہ مشہور تھے۔ مظہر علی وِلا کو فارسی کے ساتھ ساتھ سنسکرت پر بھی بڑا عبور حاصل تھا۔ چنانچہ انہوں نے بیتال پچیسی کے اردو اور آسان ترجمے میں میر امن کی بڑی مدد کی تھی۔ وِلا نے شاعری بھی کی مگر کوئی دیوان پیچھے نہ چھوڑا اگر کوئی قلمی نسخہ تھا بھی تو وہ اب نہیں ملتا۔ شاعری میں طپش، ممنون اور مصحفی کو اپنا کلام دکھاتے تھے۔ وِلا کا تعلق بھی فورٹ ولیم کالج سے تھا۔

۱۸۰۲ء سے لے کر ۱۸۰۵ء تک وِلا نے فورٹ ولیم کالج کے لیے کچھ کتابیں تصنیف و تالیف کیں۔ منشی بینی نرائن جہاں اپنے تذکرے میں لکھتے ہیں کہ وِلا ۱۸۱۳ء تک کلکتہ میں بقید حیات تھے۔ وِلا نے حسب ذیل کتابیں تصنیف کیں۔ (۱) مادھونل اور کام کندلا (۲) ترجمہ کریما (۳) ہفت گلشن (۴) اتالیق ہندی (۵) بیتال پچیسی (۶) تاریخ شیر شاہی۔

مادھونل اور کام کندلا یہ ایک قدیم قصہ ہے جسے موتی رام کبیشر نے ہندی زبان میں تصنیف کیا تھا۔ وِلا نے جان گل کرائسٹ کی فرمائش پر اسے ۱۸۰۲ء میں ترجمہ کر کے اردو زبان میں لکھا۔ یہ کتاب بھی اب نایاب ہے۔ بقول حامد حسن قادری صاحب کے برٹش میوزیم میں اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ موجود ہے۔

نمونہ نثر بہ حوالہ مولف ارباب اردو نثر۔

"بلند مکانوں کے بالا خانوں کا عالم دیکھ کر آسمان و زمین کا عالم تہ و بالا ہے، نئے طور کے مکان منقش عالی شانوں پر سنہری کلسوں کے چمکنے سے عجیب اجالا صاحب علم و ہنر نیک فعال و نیک کردار اور لوگ اچھے اچھے آرام چین سے اس بستی میں بستے تھے۔ وہ پہپاوتی نگری مشہور تھی اور راجہ گوبند چند و نقش و بخشش میں یکتا، نیک افعال، خجستہ خصال، اس سے معمور، علم و حیا سے مشہور، صورت و سیرت میں خوب، خلق طالب و مطلوب، دوست اس کے لطف سے شاد، دشمن اس کے قہر سے برباد جابجا اس کی دھاک، غرض وہاں راج راجہ اندر کی طرح کرتا تھا!"

ہفت گلشن یہ بھی اخلاقی کہانیوں کی فارسی کتاب کا ترجمہ ہے۔ فارسی زبان میں اس کتاب کو ناصر علی خان واسطی بلگرامی نے لکھا تھا۔ مظہر علی وِلا نے ڈاکٹر گل کرائسٹ کی فرمائش پر اس کا ترجمہ پہلی بار ۱۸۰۲ء میں کیا۔ اس میں بہت سی کہانیاں ہیں جن میں اخلاقی درس دیے گئے ہیں اور ہر کہانی کا کوئی نہ کوئی اخلاقی نتیجہ نکلتا ہے۔

نمونہ نثر۔

"کہانی چوتھی مرغی اور مور کی ہے۔ ایک مرغی دانے کی تلاش میں جنگل کو گئی اور ہر طرف دانہ چگنے لگی۔ کہ ناگاہ ایک سوراخ پاس انڈے کتنے ایک مار سیاہ کے پائے۔ تب خوش ہو کر نہایت شفقت و مہربانی سے ایک درخت کے نیچے ان انڈوں کو اکٹھا کر کے اپنے پروں کے نیچے لے بیٹھی اور سینے لگی . . . . ."

بیتال پچیسی اس کتاب کے بارے میں ہم پہلے بھی تفصیل کے ساتھ بیان کر چکے ہیں کہ اس سنسکرت کتاب کے ترجمے اور تالیف میں ایک اور صاحب منشی للو لال جی نے وِلا کی مدد کی تھی۔ بیتال پچیسی میں ۲۵ عدد کہانیاں ہیں جو ایک شخص بیتال سناتا ہے۔ اس کتاب کے ترجمے میں برج بھاشا کے الفاظ کثرت سے استعمال کیے گئے ہیں۔

نمونہ نثر۔

"اس عرصہ میں کسو راجہ کی بیٹی سہیلیوں کا جھنڈ ساتھ لیے ہوئے اسی تالاب کے دوسرے کنارے پر اشنان کرنے آئی۔ سو اشنان دھیان پوجا کر سہیلیوں کو ساتھ لے درختوں کی چھاؤں میں ٹہلنے لگی۔ ادھر دیوان کا بیٹا بیٹھا تھا اور راجہ کا بیٹا پھرتا تھا۔ کہ اچانک اس کی اور راجہ کی بیٹی کی نظریں چار ہوئیں۔ دیکھتے ہی اس کے روپ پر راجہ کا بیٹا فریفتہ ہوا۔ اور اپنے دل میں کہنے لگا۔ کہ اے چنڈال کام دیو مجھ کو کیوں ستاتا ہے اور اس راجہ پتری نے اس کنور کو دیکھ کر سر میں جو کنول کا پھول پوجا کر کے رکھا تھا وہی پھول ہاتھ میں لے۔ کان سے لگا۔ دانتوں سے کتر۔ پاؤں تلے دبا پھر اٹھا چھاتی سے لگا اور سہیلیوں کو ساتھ لے سوار ہو، اپنے مکان کو گئی۔ ادھر راج پتر نہایت نراس ہو برہ میں ڈوبا ہوا دیوان کے پاس آیا اور ساتھ شرم کے اس کے آگے حقیقت کہنے لگا۔"

تاریخ شیر شاہی یہ کتاب سب سے پہلے فارسی زبان میں لکھی گئی۔ اس تاریخی کتاب میں دہلی کے بادشاہ شیر شاہ سوری کے عہد کے حالات تفصیل کے ساتھ درج ہیں۔ اس کتاب کا مصنف عباس خان شیروانی تھا جس نے یہ کتاب حسب الحکم مغل شہنشاہ جلال الدین اکبر کے تصنیف کی تھی۔ مظہر علی وِلا نے اسے فورٹ ولیم کالج کے کیپٹن جیمز ماؤنٹ کے حکم کے مطابق اردو میں منتقل کیا۔ یہ ترجمہ ۱۸۰۵ء میں اختتام پذیر ہوا۔ مگر نوبت شائع ہونے کی نہ آئی۔ مشہور فرانسیسی مستشرق گارساں دتاسی نے ۱۸۴۵ء میں اسے فرانسیسی زبان میں ترجمہ کیا۔ مولف ارباب نثر اردو نے لندن میں جو اس کتاب کا قلمی نسخہ موجود ہے اس میں سے ایک اقتباس درج کیا ہے ملاحظہ ہو۔

"اس نے کہا اپنے بھائی میرداد کو شیر خان کے پاس بھیجیے تاکہ وہ اس سے یہ قرار داد کرے کہ ہم قلعہ دیتے ہیں لیکن اس شرط سے کہ تو عہد کرے کہ جس بیٹے بدبخت نے باپ کو مارا ہے اس کی ناک اور کان کاٹے تا اوروں کو کان ہوں۔ جب میرداد شیر خان کے پاس گیا۔ اس سے یہ قسمیہ عہد و پیمان کیا کہ ملکہ اور تم تینوں بھائیوں کے ساتھ کسی قسم کی مخالفت نہیں کروں گا اور مہمانداری کی رسم بخوبی بجا لایا۔ کوئی فرو گذاشت نہ کی اور اس کے آنے سے نہایت خوش ہوا۔ محبت اور اخلاص حد سے زیادہ کیا اور کہا کہ اگر ملکہ میرے تئیں قلعے دیوے اور مجھ سے نکاح کرے تو میں اس کا نہایت ممنون احسان ہوں گا۔ مرغ دل کا لشکار کرنا احسان سے خوب ہے اور اچھے کاموں سے ہے۔"

علاوہ بریں تزک جہانگیری کے ایک حصے کا ترجمہ بھی اردو میں وِلا نے کیا

مگر یہ کتاب نایاب ہے۔

مرزا کاظم علی جوان

حالات ونگارشات مرزا کاظم علی جوان کی ولادت عروس البلاد دہلی ہی میں ہوئی۔ بچپن اسی شہر نگاراں کی گلیوں میں بسر کیا۔ شروع شروع میں شعروشاعری سے بھی دلچسپی رہی۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ طبیعت نثر اور تراجم کی طرف مائل ہوتی گئی۔ دہلی میں حالات سازگار نہ رہے تو وہاں سے سکونت ترک کرکے لکھنؤ میں آگئے۔ یہاں کے ریذیڈنٹ اس وقت کرنل سکاٹ تھے۔ ان سے ملاقات ہوئی تو وہ مرزا کاظم علی جوان کی علمی صلاحیتوں سے بہت متاثر ہوئے۔ انہوں نے جوان کے لئے "تگ ودو" کی اور فورٹ ولیم کالج میں ملازمت دلوادی۔ فورٹ ولیم کالج میں جاکر جوان کے جوہر چمکے اور انہوں نے وہاں بڑا کام کیا۔ اس زمانے میں کالیداس کی کتاب "شکنتلا" کا کالج میں بڑا چرچا تھا۔ نواز کبیشر نامی ایک شخص نے سنسکرت سے ڈرامے شکنتلا کا ترجمہ برج بھاشا میں کیا تھا۔ جوان نے اس ترجمے کو سامنے رکھ کر کالیداس کے ڈرامے "شکنتلا" کا ترجمہ اردو زبان میں کیا۔ چنانچہ وہ اس ترجمے کے شروع میں وہ خود لکھتے ہیں۔

"دوسرے ہی دن ڈاکٹر گل کرائسٹ صاحب نے نہایت مہربانی اور الطاف سے ارشاد فرمایا کہ "شکنتلا" کا ترجمہ اپنی زبان کے موافق کر اور للولال جی کو حکم کیا کہ روزانہ لکھایا کرے۔ اگرچہ کبھی سوا نظم کے نثر کی مشق نہ تھی لیکن خدا کے فضل سے بخوبی انصرام ہوا کہ جس نے سنا پسند کیا اور اچھا کہا۔ بہت سا پڑھنے لکھنے میں آیا اور کچھ چھپ کر اتفاقات سے رہ گیا۔

ان دنوں میں کہ ۱۸۰۴ء میں اور احقر قرآن شریف کے ہندی ترجمے کا محاورہ درست کرتا ہے۔ صاحب ممدوح نے فرمایا کہ ہم چاہتے ہیں اس کتاب کو چھپوادیں۔ نظرثانی لازم ہے اور لال جی سے کہا کہ تم بھی اس کتاب سے مقابلہ کرو کہ اگر کہیں مطلب کی کمی بیشی ہوئی ہو تو نہ رہے۔ چنانچہ ہم ان کا فرمانا بجا لائے۔ پھر موافق حکم صاحب کے بندے نے تھوڑا سا دیباچہ اور بھی لکھا۔"

نمونہ ترجمہ۔

"مرزا کاظم علی جوان نے "شکنتلا" ناٹک کا ترجمہ مقفیٰ اور سلیس عبارت میں کیا ہے۔" نمونہ ملاحظہ ہو۔

"غرض اس تپشوی کا یہی حال تھا۔ آٹھوں پہر تپ جپ کا خیال تھا چونسٹھ برس تک وہ بیابان نورد تھا۔ سر سے لگا کر پاؤں تک وہ گرد گرد تھا۔ بناس پتی کھاتا تھا۔ بھوک پیاس کی ایذائیں سہنا اور روبہ آفتاب ہوکر ے

•

گرمیوں میں وہ جگر تفتہ جلا کر گرد آگ
بیٹھتا تھا ڈھیر جیسے راکھ کا آوے نظر
اور جاڑوں میں گلے تک پانی میں ہو کر کھڑا
جپ کیا کرتا تھا شوق دل سے ہر شام وسحر

ایسی باتیں سن کر راجہ اندر کو بہت سوچنا پڑا۔ ڈر دل میں ہوا۔ اس کے جوگ کو توڑنے کے لئے منوکا پری کو بلا کر بہت سی آؤ بھگت کی اور یہ احوال ظاہر کیا کہ وہ راجہ کے حسن سلوک سے بہت خوش ہوئی۔ اور اس مطلب کے سنتے ہی یوں بولی۔ کہ میں وہ پری ہوں کہ اگر میرا سایہ برہما۔ وشنو۔ مہادیو پر پڑے تو وہ بھی دیوانے ہو جاویں ے

•

جو وے ہوویں وحشی تو کرلوں میں رام
مری یاد میں بھولیں سب اپنا کام
یہ ایسی ہیں جادو بھری انکھڑیاں
رہے دیکھ کر ان کو سدھ بدھ کہاں
یہ احوال جب ایسے لوگوں کا ہو
رکھوں پاک دامن میں کب اور کو

وشوامتر کو ایک پل میں اپنے پر دیوانہ کرلوں۔ تمام عمر کو قشقہ کی جاگہ یہ کلنگ کا ٹیکہ ماتھے پر دھردوں۔

"وہ ایک ایسا ستارہ تھی کہ تمام عالم کو جس نے روشن کردیا۔ تس پر سنگار بارہ ابھرن جو اس نے سر سے پاؤں تلک کئے۔ دن کو سورج اس کا جلوہ دیکھ کر رشک کی آگ سے جلا اور رات کو چاند غیرت سے داغ ہوکر سیاروں کے انگاروں پر لوٹا۔۔۔۔۔"

سارا ترجمہ شگفتہ اور با محاورہ ہے۔ شکنتلا کے علاوہ کاظم علی جوان نے ایک لمبی نظم بعنوان دستور ہند بھی لکھی اور تاریخ فرشتہ کے کچھ ابواب بھی اردو میں ترجمہ کئے۔

مولوی امانت اللہ شیدا

کوائف بقول حامد حسن قادری صاحب مؤلف "داستان تاریخ اردو"۔ مولوی امانت اللہ شیدا کے حالات زندگی کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔ ان کا وطن کونسا تھا؟ وہ کہاں پیدا ہوئے؟ اور کس جگہ کس سن میں وفات پائی؟ ان تمام باتوں پر ایک پردہ پڑا ہے۔ صرف اتنا معلوم ہے کہ شیدا بھی فورٹ ولیم کالج میں ملازم تھے اور عربی فارسی پر انہیں عبور حاصل تھا علاوہ بریں علوم شرقیہ سے بھی گہری واقفیت تھی۔ چنانچہ انہوں نے کالج کی ملازمت سے پہلے ایک ضخیم کتاب عربی زبان میں بابت اسلامی فقہ کے لکھی جسکا نام انہوں نے "ہدایت الاسلام" رکھا تھا۔ اس کتاب کا انہوں نے خود ہی اردو میں بھی ترجمہ کیا تھا۔ یہی کتاب جب فورٹ ولیم کالج کے ڈاکٹر جان گل کرائسٹ نے دیکھی تو وہ شیدا کی قابلیت اور تبحر علمی سے بہت متاثر ہوئے اور ان کو کالج میں مترجم کی حیثیت سے ملازم رکھ لیا۔

ان کی تصانیف حسب ذیل ہیں۔

۱۔ اردو ترجمہ ہدایت الاسلام ۲۔ اردو ترجمہ اخلاق جلالی ۳۔ ترجمہ قرآن مجید ۴۔ صرفِ اردو (منظوم)

ہدایت الاسلام جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں۔ یہ کتاب مولوی امانت اللہ شیدا نے عربی زبان میں لکھی۔ یہ اسلامی فقہ کے بارے میں ہے۔ پھر شیدا نے خود ہی دو جلدوں میں اسی نام سے اس کتاب کا اردو

میں ترجمہ کیا۔ اس کتاب کی پہلی جلد فورٹ ولیم کالج کی طرف سے ۱۸۰۴ء میں شائع ہوئی۔ ڈاکٹر گل کرائسٹ اس کتاب سے اتنے متاثر ہوئے کہ انہوں نے اس کا خود ہی انگریزی زبان میں ترجمہ کیا۔

نمونہ نثر —

"فصل کعبے کے درمیان نماز پڑھتے ہیں۔ فرض کی یا نفل کی نماز کعبہ کے اندر صحیح ہے۔ اگرچہ مقتدی کا منہ امام کی طرف ہو اور جو مقتدی کی پیٹھ اس کے منہ کی طرف ہو تو نماز اس کی صحیح نہیں ہوتی ہے اور کعبے کے اوپر مکروہ ہے اور کعبہ کے چاروں طرف اقتدا کرنا گو بعضے مقتدی امام کی نسبت سے اس کی طرف نزدیک ہوں، صحیح ہے۔ پہ امام جس جانب میں ہے اگر مقتدی اس طرف کو امام کی نسبت سے کعبہ کی طرف نزدیک ہو تو اس کی نماز درست نہیں۔ کیونکہ اس تقدیر میں وہ امام کے آگے ہو جاوے گا۔"

ترجمہ قرآن مجید مولوی امانت اللہ شیدا نے ہدایت الاسلام کے ترجمے کا کام ختم کیا تو پھر میر بہادر علی حسینی کے مشورے کے ساتھ انہوں نے قرآن حکیم کا اردو ترجمے کا کام شروع کیا یہ کام مکمل نہ ہو سکا۔ کیونکہ جان گل کرائسٹ بیماری کی وجہ سے ولایت چلے گئے۔ ان کی جگہ جو صاحب آئے انہوں نے اس کام کو روک دیا بلکہ جو ترجمہ ہو چکا تھا اسے بھی نہ چھپوایا۔

جامع الاخلاق یہ کتاب اخلاق جلالی کا ترجمہ بہ زبان اردو ہے۔ کتاب کے آخر میں شیدا لکھتے ہیں۔

"جولائی کی بیسویں دوشنبہ کے دن ۱۸۰۵ء کے بہت محنت جانفشانی اور فضل یزدانی کی مدد اور صاحبان عالی شان کے اقبال کی برکت سے احقر ہیچ مداں نے کتاب لوامع الاشراق فی مکارم الاخلاق عرف اخلاق جلالی کے ترجمہ سے فراغت پائی۔ ولیکن داناؤں کے نزدیک پوشیدہ نہ رہے کہ اس کے مطالب کو جو فارسی عبارت کے صدف میں نہاں تھے غواص طبیعت نے دریائے فکر میں کس کس طرح سے غوطے مار کر نکالا اور ان آبدار موتیوں کو رشتہ تحریر میں پرو کر ریختہ زبان کے اردو بازار میں لا حاضر کیا۔"

تنقید مولوی امانت اللہ شیدا کا ترجمہ بہت مشکل اور دقیق ہے ... عبارت عربی فارسی کی بندشوں میں جکڑی ہوئی ہے جس کی وجہ سے ترجمے میں روانی اور سلاست مفقود ہے۔ ایک ٹکڑا ملاحظہ ہو۔

"لیکن بہ مقتضائے اس کے کہ معانی اس کے اسرار حکمت پر مشتمل اور احکام مصلحت کو شامل تھے۔ یہ تشبیہ اس خیال سے کہ شاہد متناسب الاعضا اور عروس خود زیبا کو کیا پرنیاں اور کیا دیبا، ہر لباس میں ہے وہ خوشنما، اس کی زلف مطالب کی عقدہ کشائی ناخن فکر تیز کر کے عقل حکمت شناس کی مشاطگی سے آراستہ کیا۔"

اس کے باوجود اس کتاب میں کہیں کہیں ہمیں ایسی عبارت بھی مل جاتی ہے جو سلیس ہے اور جس میں سادگی و روانی بھی ہے۔

"اس واسطے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ہر ایک تم میں سے اپنے اعضائے جسمانی اور قوائے نفسانی کا نگہبان ہے۔ وہ قیامت میں پوچھا جائے گا ان کے احوال سے۔ اور جب فرمایا کہ عادل لوگ منبر کے اوپر حق سبحانہ تعالیٰ کے نور کی مثال ہیں۔ صحابیوں نے پوچھا۔ وے کون آدمی ہیں؟ فرمایا وہ جو پہلے اپنے حق میں اور اپنی اولاد کے حق میں عدالت کریں۔ پھر ان کے حق جو ان کے ملک میں اور ان کے تابع فرمان رہیں۔"

حامد حسین قادری صاحب نے تلاش بسیار کے بعد جامع الاخلاق کا ایک ٹائپ میں چھپا ہوا نسخہ دیکھا۔ چنانچہ انہوں نے اپنی کتاب میں اس نسخے کے ناشر کی عبارت نقل کی ہے۔ ملاحظہ ہو۔

"یہ کتاب لوہے کے ٹائپ میں چھپی ہے۔ شائع کرنے والا لکھتا ہے۔ اب ۱۲۶۴ھ میں موافق ۱۸۴۸ء کے خادم الطلبا احقر غلام حیدر ساکن ہوگلی نے اس ترجمے کو کلکتے کے بیچ مطبع احمدی میں چھاپا تاکہ طالب علموں کو اس سے فائدہ پہنچے اور عاصی کو ثواب ملے —

•

ہر ایک حکایت ہے حدیث لب شیریں
ہر ایک ورق اس کا نقاب رخ لیلیٰ
گر خواں پہ تحسین کے سخن کی ہو مدارات
مہمان ہو یہ اردو ہوں سب اس کے طفیلی

• • •

شیخ حفیظ الدین

حالات و نگارشات شیخ حفیظ الدین کے آباد اجداد ملک عرب کے رہنے والے تھے۔ وہاں حالات ناساعد ہوئے تو ہجرت کر کے حیدر آباد دکن آ گئے۔ دکن میں ان لوگوں کی گزر بسر تجارت پر ہوتی تھی۔ کچھ عرصہ دکن میں گزارا۔ پھر وہاں سے بھی ترک وطن کیا اور بنگال چلے گئے۔ بنگال میں یہ وارن ہیسٹنگز کا عہد تھا۔ شیخ حفیظ الدین کے والد ماجد کا نام شیخ جلال الدین تھا۔ وہ عربی فارسی کے بڑے عالم تھے۔ اسی زمانے میں وارن ہیسٹنگز نے جو کہ ہندوستان کا گورنر جنرل تھا شہر کلکتہ میں ایک کالج بنایا جس کا نام نیٹو کالج رکھا۔ شیخ حفیظ الدین کے والد کی ملاقات ایک دوست کے ذریعے گورنر جنرل سے ہوئی۔ جس نے انہیں کالج میں استاد کی حیثیت سے ملازم رکھ لیا۔ اس وقت شیخ حفیظ الدین چھوٹے تھے چنانچہ انہیں اسی نیٹو کالج کے مدرسے میں داخل کر دیا گیا۔ یہ فورٹ ولیم کالج کے قیام سے پہلے کا زمانہ ہے۔ شیخ حفیظ الدین زیور تعلیم سے آراستہ ہوئے تو کلکتے میں ہی فورٹ ولیم کالج کا قیام عمل میں آیا چنانچہ ڈاکٹر گل کرائسٹ نے انہیں ان کے والد کی جگہ کالج میں استاد مقرر کر دیا۔ ان کا کام ترجمہ و تالیف تھا۔

خرد افروز شیخ حفیظ الدین نے کلیلہ و دمنہ کی داستان کے فارسی ترجمے کو اردو میں منتقل کیا۔ فارسی ترجمہ شیخ ابوالفضل کا تھا۔ جیسا کہ ہم کلیلہ و دمنہ کے بارے میں پہلے بیان کر چکے ہیں کہ یہ کتاب اصل میں سنسکرت زبان میں لکھی گئی۔ اس کا ترجمہ ایران میں فارسی زبان میں ہوا۔ ایران سے یہ کتاب عرب پہنچی اور اس کے ترجمے عربی زبان میں ہوئے۔ پہلی بار اردو میں اس کا ترجمہ شیخ حفیظ الدین نے کیا اس ترجمے میں شیخ صاحب کے والد نے بھی ان کی کافی مدد کی۔ یہ ترجمہ جب جان گل

گرائسٹ کو دکھایا گیا تو انھوں نے عبارت کے اسلوب کو بے حد پسند کیا۔۔ چنانچہ فورٹ ولیم کالج کی طرف سے یہ کتاب پہلی بار ۱۸۰۵ء میں شائع کی گئی۔ اس ترجمے کی ایک جھلک پیش خدمت ہے۔ اگرچہ عبارت میں میرامن کی سی روانی اور ادبی چاشنی نہیں ہے پھر بھی ترجمہ بامحاورہ اور سادہ زبان میں ہے۔۔۔۔۔

"چاروں دوست ایک دل خوشی سے منزل طے کرتے اور ایک دوسرے کو دیکھ کر فارغ بال و آسودہ حال رہتے تھے۔ دور دراز منزل کو طے کر کے شہر نظور میں پہنچے اور شہر کے ایک کنارے اچھی جگہ اترے۔ کسی کے پاس کچھ خرچ کو نہ رہا تھا۔ ان یاروں میں سے ایک نے کہا۔ اب وقت ہے کہ ہر کوئی اپنا اپنا ہنر دکھلا دے اور زور بازو سے کچھ بہم پہنچا دے تو چین سے چند روز اس شہر میں رہیں۔ بادشاہ زادے نے کہا۔ سب کام خدا کی تقدیر پر موقوف ہیں۔ آدمی کی کوشش سے سر انجام نہیں ہو سکتے۔ جو لوگ دانا ہیں اس کی تلاش میں نہیں دوڑتے۔ خوبصورت جوان نے کہا۔ حسن دولت کو حاصل کرنے میں بڑا ایک وسیلہ ہے۔ جہاں اس کی نمود ہے دولت تابع ہوگی۔ سوداگر بچہ نے بھی حال اپنا ظاہر کر کے کہا کہ حسن کی پونجی معاملہ کے بازار میں ایک متاع بے بہا ہے اور تھوڑے عرصے میں اس سے کچھ منفعت نہیں ہوتی ہے۔ رائے صواب و تدبیر درست اور کاردانی اور معاملہ فہمی کا فائدہ سب چیزوں سے زیادہ ہے۔ جو بہ سامان اس کو اختیار کرے جلد اپنے مطلب کو پہنچے۔ دہقان بچے نے کہا کہ معاملہ فہمی و کاردانی سب وقت کام نہیں آتی ہے۔ اکثر میں نے دانا کو حیران اور نادان کو کامیاب دیکھا ہے۔ بخت سے کسب اور کوششیں ہیں جو آدمی کو کامیاب اور مقصدور بناتی ہیں اور ہنر حرفہ عقلمند کے سامان دولت کا وسیلہ ہوتا ہے۔"

• • •

خلیل علی خان اشک

داستان امیر حمزہ خلیل علی خان اشک نے داستان امیر حمزہ کا ترجمہ اردو زبان میں کیا تھا۔ یہ ترجمہ گل کرائسٹ کی خواہش کے مطابق ۱۸۰۱ء میں مکمل ہوا۔

"مخفی نہ رہے کہ بنیاد اس قصہ دلچسپ کی سلطان محمود بادشاہ کے وقت سے ہے اور اس زمانے میں جہاں تک راویان شیریں کلام تھے انھوں نے آپس میں مل کر واسطے سنانے اور یاد دلانے منصوبے لڑائیوں اور قلعہ گیری اور ملک گیری کے خاص بادشاہ کے واسطے امیر حمزہ صاحب کے قصہ کی چودہ جلدیں تصنیف کی تھیں۔ ہر رات کو ایک داستان حضور میں سناتے تھے اور انعام و اکرام پاتے تھے۔ اب شاہ عالی جاہ عالم بادشاہ کے عہد میں مطابق سنہ بارہ سو پندرہ ہجری اور سنہ اٹھارہ سو ایک عیسوی کے خلیل علی خان نے جو تخلص بہ اشک ہے۔ حسب خواہش مسٹر گل کرسٹ صاحب عالی شان والا مناقب بنا بر آموختن زبان ہندی اس قصہ کو اردوئے معلیٰ میں لکھا تاکہ صاحبانِ مبتدیان کے پڑھنے کو آسان ہووے"

خلیل علی خان کا بہترین کارنامہ داستان امیر حمزہ کا اردو ترجمہ ہی ہے ان کے بعد مطبع نولکشور کی جانب سے اس کتاب کا ترجمہ سید تصدق حسین نے بھی کیا اور شائع ہوا۔ لیکن سید تصدق حسین کی زبان نے قصے کو ایک پرپیچ نگار خانہ بنا دیا ہے۔ عبارت مقفیٰ اور مشکل تراکیب سے بھری پڑی ہے۔ اس کے مقابلے میں خلیل علی خان اشک کی عبارت سادہ اور سلاست سے پُر ہے۔ اگرچہ اس نے بھی کہیں کہیں عبارت کو شاعرانہ تخیل عطا کیا ہے۔ سب سے پہلے سید تصدق حسین کی عبارت ملاحظہ ہو۔

"نخل بندانِ بوستان اخبار چمن پیرایان گلستان اظہار، تختۂ کاغذ صاف میں اس طرح اشجار الفاظ موقع بموقع نصب فرماتے ہیں۔ صحن شفاف قرطاس کو گل دریا حسین مضامین رنگا رنگ سے یوں رشک تختۂ ارژنگ بناتے ہیں کہ جب باغ بیداد تیار ہوا نمونہ بہشت شداد نمودار ہوا۔۔۔۔۔"

خلیل خان اشک نے اسے یوں بیان کیا ہے۔

"یہاں سے دو کلمہ داستان ملک یالتقش کے ملاحظہ فرمائیے"

جبکہ وہ باغ تیار ہوا، ایک دن بادشاہ کے حضور میں عرض کی غلام نے ایک باغ حضور کی بدولت بنایا ہے اور بندہ امیدوار ہے کہ ظل سبحانی وہاں رونق افروز ہو کر ایک چمچہ آش نوش فرمائیں کہ باعث عزت ازدیاد خانہ زاد ہے۔"

اس کے بعد خلیل علی خان اشک نے اکبر نامہ بھی لکھا۔

• • •

اکرام علی

حالات و تخلیقات اکرام علی کے حالات زندگی، سن ولادت و سن انتقال پردہ گمنامی میں ہیں۔ یہ بھی فورٹ ولیم کالج میں لِڈلا وغیرہ کے ساتھ کام کرتے تھے اور وہیں ملازم تھے۔ ان کی پہلی کتاب "اخوان الصفا" کے نام سے ۱۸۱۰ء میں ترجمہ ہو کر چھپی۔ رسالہ اخوان الصفا عربی میں لکھا گیا تھا جس کا ترجمہ اکرام علی نے اردو میں کیا۔ اس میں انسان کی دیگر حیوانوں پر فضیلت کے بارے میں بحث کی گئی ہے

نمونہ نثر — اکرام علی رسالے کے متعلق خود لکھتے ہیں۔

"جب میں بموجب حسن ایما صاحب نامدار — خداوند نعمت مسٹر ابراہیم لاکٹ صاحب بہادر جی دام اقبالہٗ کے اور موافق طلب اخی و استاذی جناب بھائی صاحب مولوی تراب علی صاحب دام ظلہم کے شہر کلکتہ میں آیا اور رہنمونی طالع سے بعد حصول شرف ملازمت مورد عنایت و مرحمت ہوا۔ از بسکہ صاحب موصوف کو کمال پرورش منظور تھی، سرکار کمپنی بہادر میں نوکر رکھوا کر اپنے پاس متعین کر لیا۔ بعد چند روز کے باستصواب جناب علی شان — مدرس ہندی کپتان جان ولیم ٹیلر صاحب بہادر دام دولتہٗ نے فرمایا کہ رسالہ اخوان الصفا کہ انسان و بہائم کے مناظرے میں ہے تو اس کا زبان اردو میں ترجمہ کر لیکن نہایت سلیس کہ الفاظ مغلق اس میں نہ ہو ویں۔ بلکہ اصطلاحات علمی اور خطبے بھی اس کے تکلف سے

خالی نہیں ہیں قلم انداز کر، حرف خلاصہ مضمون مناظرہ کا ہونا چاہیئے، مترجم نے بموجب فرمانے کے فقط حاصل مطلب کو محاورہ اردو میں لکھا خطبوں کو نکال ڈالا۔ اور اکثر اصطلاحات علمی کہ مناظرہ کو ان سے علاقہ نہ تھا۔ ترک کیں۔ مگر بعضے خطبے اور اصطلاحات ہندی وغیرہ کہ اصل مطلب سے متعلق تھے باقی رکھے ۔"

اب اصل رسالہ اخوان الصفا کی نثر اردو کا نمونہ ملاحظہ فرمائیں۔

"بادشاہ نے کہا یہ جو اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ ہم نے انسان کو بڑی احسن تقویم کے ساتھ خلق کیا ہے۔ یعنی انسان کو ہم نے بڑا سڈول بنایا ہے اس کا کیا جواب دیتے ہو؟ اس نے عرض کی جہاں پناہ، کلام ربانی میں ظاہری معنوں کے سوا بہت سی تاویلیں ہیں کہ بغیر اہل علوم کے کوئی نہیں جانتا۔ تفسیر اس کی عالموں سے پوچھا چاہیئے چنانچہ ایک حکیم دانش چند نے بموجب حکم بادشاہ کے مطلب اس آیت شریفہ کا یوں بیان کیا۔ جس میں اللہ تعالےٰ نے آدم کو پیدا کیا۔ شبھ گھڑی نیک ساعت تھی۔ ستارے اپنے اپنے برج شرف میں جلوہ گر اور ہیولیٰ عناصر کے، واسطے قبول کرنے صورتوں کے، آمادہ و مستعد تر تھے۔ اس لئے صورتیں اچھی، قد سیدھے، ہاتھ پاؤں درست بنے اور احسن تقویم کے ایک معنی اور بھی اس آیت سے ظاہر ہوتے ہیں یعنی اللہ تعالےٰ نے انسان کو حدِ اعتدال پر پیدا کیا ہے۔ نہ بہت لمبا بنایا نہ چھوٹا بادشاہ نے کہا۔ اس قدر اعتدال اور مناسب اعضا کے واسطے فضیلت سے کفائیت کرتی ہے۔ حیوانوں نے عرض کی کہ ہمارا بھی یہی حال ہے اللہ تعالےٰ نے ہم کو بھی ساتھ اعتدال کے جو مناسب تھا ہر عضو بخشا۔ اس فضیلت میں ہم اور وے برابر ہیں۔ انسان نے جواب دیا کہ تمہارے لئے مناسبت اعضا کی کہاں ہے۔

صورتیں نپٹ مکروہ، قد بے موقع، ہاتھ پاؤں بھدے سے کیونکہ تم میں سے ایک اونٹ ہے۔ ڈیل بڑا گردن لمبی، دُم چھوٹی، اور ہاتھی ہے کہ جس کا ڈیل ڈول بہت بڑا اور بھاری، دو دانت منہ سے باہر نکلے ہوئے۔ کان چوڑے آنکھیں چھوٹی چھوٹی ــــ"

مزید نمونہ اسی رسالے میں سے۔

"بادشاہ نے کہا۔ جنوں کی قوم میں نیک و بد اور مسلمان و کافر ہوتے ہیں جس طرح انسانوں میں۔ جو کہ نیک ہیں وہ اپنے رئیس کی اطاعت و فرماں برداری اس قدر کرتے ہیں کہ آدمیوں سے کبھی نہیں ہو سکتی۔ اس واسطے کہ اطاعت و فرماں برداری جنات کی مثل ستاروں کے ہے۔ آفتاب ان میں بمنزلہ بادشاہ ہے اور سب ستارے بجائے فوج و رعیت کے ہیں۔ چنانچہ مریخ سپہ سالار، مشتری قاضی، زحل خزانچی، عطارد وزیر، زہرہ حرم، ماہتاب ولی عہد اور ستارے گویا فوج و رعیت ہیں۔ اس واسطے کہ سب آفتاب کے تابع ہیں۔ اس کی حرکت سے حرکت کرتے ہیں۔ وہ جو ٹھہر رہتا ہے۔ سب متفق ہو جاتے ہیں۔ اپنے معمولی حد سے تجاوز نہیں کرتے۔ یعسوب نے پوچھا کہ ستاروں نے یہ خوبی و اطاعت و انتظام کی کہاں سے حاصل کی۔ بادشاہ نے کہا۔ یہ فیض ان کو فرشتوں سے حاصل ہے کہ وہ سب اللہ تعالیٰ کی فوج ہیں اور اس کی اطاعت کرتے ہیں ــــ"

• • •

نہال چند لاہوری

حالات و تخلیقات

نہال چند لاہوری، لاہور کے رہنے والے تھے۔ ان کے آبا و اجداد دہلی ہی کے رہنے والے تھے اور اسی شہر نگاراں میں پشت در پشت سے آباد چلے آ رہے تھے۔ لیکن نہال چند لاہوری دہلی سے ترک وطن کر کے کسب معاش کے سلسلے میں لاہور آ گئے۔ یہ شہر انہیں اتنا پسند آیا کہ اپنے نام کے ساتھ بڑے شوق اور محبت سے لاہوری لکھنے لگے۔۔ چنانچہ نہال چند لاہوری کہلائے۔ اس وجہ سے شک ہوتا ہے کہ وہ لاہور ہی کے باشندے ہوں گے۔ جبکہ ایسا نہیں ہے۔ بہر حال تذکروں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انہیں لاہور سے بڑی عقیدت تھی اور میاں وہ قلعہ کے عقبی محلے میں رہا کرتے تھے۔ فارسی پر پورا پورا عبور حاصل تھا۔ کسی حد تک عربی میں بھی درک تھا اور سنسکرت بھاشا میں بھی شُدبُد رکھتے تھے۔ ان کے تعلقات کلکتہ کے ایک انگریز کپتان ولورٹ سے بہت تھے۔ کپتان ولورٹ جب بھی لاہور آتے تو نہال چند لاہوری سے ضرور ملاقات کرتے۔ ایک بار کپتان صاحب نے نہال چند لاہوری سے کہا کہ وہ فورٹ ولیم کالج میں ملازم کیوں نہیں ہو جاتے تاکہ وہاں جا کر اپنے جوہر طبع کو آزمائیں۔ چنانچہ نہال چند لاہوری کو ان کپتان صاحب نے فورٹ ولیم کالج میں ملازم کروا دیا۔

فورٹ ولیم کالج میں نہال چند لاہوری کی ملاقات گل کرائسٹ سے ہوئی اور انہوں نے انہیں قصہ گل بکاؤلی فارسی کو اردو میں ترجمہ کرنے کے لئے کہا فارسی میں یہ کہانی عزت اللہ بنگالی نے لکھی تھی پہلی بار اردو میں اسے نہال چند لاہوری نے ترجمہ کیا اور اس کا نام مذہب عشق رکھا۔ ترجمہ بہت سلیس اور عبارت آرائی دلکش ہے۔ یہ کتاب پہلی بار ۱۸۰۴ء میں فورٹ ولیم کالج کی طرف سے چھپی۔ بعد میں اس کہانی کو پنڈت دیا شنکر نسیم نے نظم کر کے مثنوی کے رنگ میں لکھا۔

"مذہب عشق" کا نمونہ نثر۔

"اس نے کہا کہ آج تم بیٹھے میرے آقا کے باورچی خانے میں لے چلو۔ دولت خانہ اس کا نزدیک ہے۔ اس نے اس ویرانہ میں ایک شہر آباد کیا ہے۔ واجبی قیمت ملے گی۔ بلکہ ایسا انعام پاؤ گے کہ پھر کبھی اور لکڑیاں بیچنے نہ جاؤ گے۔ انہوں نے کہا۔ ہماری تمام عمر اسی کام میں اور اسی جنگل سے لکڑیاں بیچاتے گذری ہے۔ لیکن آبادی کا یہاں نشان نہ دیکھا نہ سُنا۔ ساعد نے کہا ذرا تم آگے بڑھ کر دیکھو۔ اگر میرے کہنے کا کچھ اثر ظاہر ہو تو بہتر۔ نہیں تو پھر آنے کا کوئی مانع نہ ہوگا۔ لکڑہارے انعام کے لالچ سے ساعد کے آگے ہو لئے۔ پھر تھوڑی دور جا کر سب ایک بارگی پکار اٹھے کہ نعوذ باللہ من الشیطان الرجیم! اے میاں، تم ہمیں آگ میں جھونکنے کو لئے جاتے ہو۔ چولہے میں جائے انعام، بھاڑ میں پڑے اکرام، بس ہمیں معاف کر دو۔ ہم نے بھر پایا۔ ساعد نے کہا۔ یہ مشعلِ آتش نہیں۔ حویلی کے جواہرات چمک رہے ہیں۔ تم ہرگز اندیشہ نہ کرو۔ اور میرے ساتھ چلے آؤ۔ وہ اس کے کہنے سے کچھ اور بھی بڑھے۔ آگے ساری زمین سونے کی نظر آئی۔ سب نے اس کی بات سچی پائی۔ قدم اٹھائے بے دھڑک چلے ــــ"

نہال چند لاہوری نے اس کتاب کے آخر میں نام ہی سے ہجری و عیسوی تاریخیں بھی نکالی ہیں۔ تاریخیں یوں ہیں۔

؎ غرض جس طرح سے کیا ان کو شاد
ہماری بھی دے یا الٰہی مراد

یہ قصہ ہوا جب بخوبی تمام
تو پھر فکر تاریخ تھی صبح و شام
یکایک سُنی میں نے آوازِ غیب
کہ ہے "مذہب عشق" تاریخ و نام

۱۲۲۷ھ

ہوئی پھر یہ خواہش کہ کلک و زبان
کریں عیسوی سال کو بھی عیاں
تو پھر ہاتفِ غیب نے دی ندا
کہ اس "مذہب عشق" میں کوئی آ
کرے "مشرب جام" اگر اختیار
تو رازِ نہاں اس پہ ہو آشکار

۱۲۲۷ھ

یعنی اگر "مذہب عشق" میں مشرب جام ۵۸۶ کو ملا دیا جائے تو پوری عیسوی تاریخ یعنی ۱۸۰۳ء نکل آتی ہے۔

• • •

بینی نرائن جہاں

حالات و کوائف

بینی نرائن جہاںؔ کا خاندان صدیوں سے پنجاب کے شہر نگاراں لاہور میں آباد تھا۔ خواجہ اکرم بیگ نے اپنی کتاب "تاریخ لاہور قدیم" میں یہاں کے پرانے رئیس گھرانوں کا ذکر کرتے ہوئے مہاراجہ لکشمی نرائن کا بھی ذکر کیا ہے جو بینی نرائن جہاںؔ کے والد تھے اور لاہور کے بڑے اعلیٰ اور صاحب ثروت رئیسوں میں شمار ہوتے تھے۔ اس کی تحقیق کے مطابق مہاراج لکشمی نرائن لاہور کے قدیم محلے شاہ عالمی میں ایک بہت عالی شان حویلی میں رہائش پذیر تھے جو ان کے آباؤ اجداد کی نشانی تھی بینی نرائن جہاںؔ اسی حویلی میں پیدا ہوئے۔ بڑے لاڈ پیار اور ناز و نعم میں ان کا بچپن گذرا۔ گھر میں عربی فارسی کی تعلیم کا بڑا چرچا تھا۔ ان کے چچا رائے بھیم نرائن خود شاعر تھے اور رندؔ تخلص کرتے تھے۔ ان کی صحبت سے بھی جہاںؔ کو بہت فیض حاصل ہوا۔ والد کے انتقال کے بعد جائیداد رشتہ داروں میں بٹ گئی۔ چچا کی رند مشربی نے رہی سہی کسر پوری کر دی۔ جہاںؔ مفلوک الحال ہو گئے۔ اس وقت وہ جوان تھے اور تعلیم سے پوری طرح بہرہ ور تھے۔ اس عہد میں کلکتہ علم و فضل کا مرکز خیال کیا جاتا تھا۔ شاید اس لئے بھی کہ فورٹ ولیم کالج ایک ایسی جگہ تھی جہاں اہلِ علم کو پناہ ملتی تھی اور وہ فکرِ معاش سے چھٹکارا حاصل کر لیتے تھے۔

چنانچہ بینی نرائن جہاںؔ بھی لاہور سے سیدھے کلکتے روانہ ہو گئے۔ فورٹ ولیم کالج سے گل کرائسٹ جا چکے تھے۔ وہاں جہاںؔ کا کوئی جاننے والا نہ تھا۔ کلکتہ کی گلیوں میں وہ بے یار و مددگار پھرتے رہے۔ آخر حیدر بخش حیدریؔ نے ان کی دست گیری کی۔ ایک شخص کے توسط سے حیدریؔ سے تعارف ہوا۔ حیدریؔ نے جہاںؔ کے اندر جوہر قابل دیکھ لیا اور اس کی مدد کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ حیدریؔ بینی نرائن کو ساتھ لے کر فورٹ ولیم کالج آئے اور اس وقت کے انگریز پرنسپل سے جہاںؔ کا تعارف کروایا اور سفارش کی کہ اسے ملازم رکھ لیا جائے۔ چنانچہ جہاںؔ کو فورٹ ولیم کالج میں نوکری مل گئی۔ جہاں بینی نرائن نے تصنیف و تالیف کا بہت کام کیا۔ لیکن اس کی اکثر کتابیں نایاب ہو گئیں۔ چند ایک مسودے برٹش میوزیم اور انڈیا آفس میں محفوظ ہیں۔

"چار گلشن": یہ عشق و محبت کی داستان ہے اور اس کے اقتباس مؤلفِ ارباب نثر اردو نے اپنی کتاب میں درج کئے ہیں۔ ہم وہیں سے ان اقتباسات کو لے کر یہاں نقل کرتے ہیں۔ اس کتاب کی وجہ تصنیف یوں بیان کی گئی ہے کہ یہ کہانی سب سے پہلے بینی نرائن جہاںؔ نے امام بخش صہبائیؔ کو سنائی۔ وہ یہ کہانی سن کر بڑا متاثر ہوا۔ اس نے رائے دی کہ اس کہانی کو اردو میں لکھو اور کپتان ٹیلر کو پیش کرو۔ چنانچہ جہاںؔ نے "چار گلشن" کے نام سے اس کہانی کو بڑی خوبی اور مہارت سے لکھا اور کپتان ٹیلر کو دکھایا جس نے جہاںؔ کو اس کے عوض اچھی خاصی رقم انعام کے طور پر دی۔

نمونہ نثر:

"زمانہ گذشتہ کے نقل بیان کرنے والوں اور ایام سلف کے قصہ کہنے والوں نے ان نادر قصوں اور عجیب حکایتوں کے گوہر آبدار کو رشتہ بیان میں اس طرح منسلک کیا ہے کہ بیچ بلاد خجستہ بنیاد وسعت آباد ہندوستان جنت نشان کے شہروں سے کسی ایک شہر میں ایک بادشاہ جم جاہ، نہایت عالی شان، والا دودمان تھا۔ حق سبحانہ تعالیٰ نے شان و شوکت اور جاہ و حشمت اس کو اس قدر عطا فرمائی تھی کہ اس زمانے میں کوئی دوسرا بادشاہ اس کی برابری نہ کر سکتا تھا اور اس کے داب و رعب کے آگے پاؤں رستم کا بھی نہ ٹھہر سکتا تھا۔

فلک مرتبت تھا وہ کیواں شاہ   دو مشعل فروز اس کے تھے مہر و ماہ"

دیوان جہاں: ۱۸۱۴ء میں فورٹ ولیم کالج کے کپتان ابک نے بینی نرائن جہاںؔ سے فرمائش کی کہ وہ ایک تذکرہ شعرائے اردو کا لکھے۔ ان میں ایسے شاعروں کا بھی حال درج ہو جن کو زیادہ عوام نہیں جانتے۔ لیکن جو اردو میں شعر کہتے ہیں اور مشاعروں میں جا کر پڑھتے ہیں۔ اور خاص طور پر ان شاعروں کے بارے ضرور لکھا جائے جو فورٹ ولیم کالج کے سالانہ مشاعروں میں شرکت کرتے ہیں۔ بینی رائے جہاںؔ نے یہ تذکرہ لکھا۔ اسے ۱۸۱۴ء میں تمام کیا۔ اور اس کا نام "دیوان جہاں" رکھا۔ اس میں کوئی ۱۲۷ شاعروں کے احوال و کوائف درج ہیں۔ جہاںؔ نے اس کتاب میں اپنی ساری غزلیں لکھی ہیں۔ ایک طرح سے یہ اس کا دیوان بھی ہے اور تذکرۂ شعرائے اردو بھی۔

تنبیہ الغافلین:

فرانسیسی مستشرق پروفیسر گارسن دتاسی سے روایت ہے کہ بینی نرائن جہاںؔ آخری عمر میں مسلمان ہو گیا تھا اور اس نے سید احمد شہیدؒ بریلوی کے

ہاتھ پر بیعت بھی کی تھی۔ کتاب تنبیہہ الغافلین مولانا شاہ رفیع الدین دہلوی کی فارسی تصنیف ہے جو انھوں نے مولوی سید احمد شہیدؒ بریلوی کے ایما پر رقم فرمائی تھی۔ بینی نرائن جہاں نے اس کتاب کا ترجمہ اردو زبان میں کیا۔ ترجمہ انھوں نے اس طرح کیا ہے جیسے کہ ایک پکا مسلمان ہو۔ چنانچہ پروفیسر گارساں دتاسی ان کے بارے میں لکھتا ہے۔

"تنبیہہ الغافلین ایک مذہبی کتاب ہے جو فارسی زبان میں مشہور مسلمان معلم اور فرقہ وہابی کے بانی سید احمدؒ کی فرمائش پر تالیف ہوئی تھی۔ اس کتاب کے اور ترجمے بھی ہندوستانی زبان میں ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جہاں فرقہ وہابی سے تعلق رکھتا تھا۔ یا کم از کم مسلمان ہو گیا تھا کیونکہ وہ اس کتاب کے دیباچے میں اس طرح لکھتا ہے جیسے سچ مچ کا مسلمان ہو ——"

خطبات گارساں دتاسی۔ مطبوعہ انجمن ترقی اردو

بینی نرائن کا کیا ہوا ترجمہ لندن کے انڈیا آفس میں ہے۔ اس کی نثر کا ایک اقتباس درج ہے۔

"بنی اسرائیل سے ایک جگہ تین بھائی تھے۔ ان میں سے ایک بڑا دانا تھا۔ اس نے اپنے بھائیوں سے کہا۔ اے بھائیو! ماں باپ کی خدمت ہم کو سپرد کرو تو ہم بجا لائیں۔ بعد مرنے کے جب میراث ان کی ملے گی تم دونوں ہی بانٹ لیجیو۔ یہ بات سن کر وہ بہت خوش ہوئے اور ایسا ہی کیا۔ الغرض وہ اکیلا ہی خدمت ان کی کرنے لگا۔ جب ماں باپ ان کے مر گئے۔ یہ دونوں بھائی ورثہ پا کر خوش گذران کرنے لگے اور بڑے بھائی کو اس مال سے کچھ نہ دیا۔ اس نے چھوٹے بھائیوں سے کہا۔ اے بھائیو! جیسا ماں باپ کے وقت میں کھانے پینے کو پاتا تھا ایسا ہی مجھ کو دو۔ میں اور کچھ نہیں مانگتا۔ اس کی رنڈی یہ بات سن کر فضیحہ کرنے لگی۔ ایک رات اس بیچارے نے خواب میں دیکھا کہ ایک آدمی کہتا ہے کہ فلانی جگہ سو دینار سونے کے گڑے ہیں تو جا کر نکال لے۔ اس نے اعتبار نہ کیا۔ آخر یہی بات تین رات متواتر خواب میں دیکھا کیا۔ بعد اس کے جو اس جگہ کو جا کر کھودا تو وہ دینار پائے ——"

• • •

للّو لال جی

احوال وکوائف تخلیقات للّو لال جی کی وابستگی بھی فورٹ ولیم کالج سے تھی گجرات کاٹھیاواڑ کے ایک پڑھے لکھے گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ گھرانہ بعض وجوہات کی بنا پر گجرات کاٹھیاواڑ سے ترک سکونت کر کے شمالی ہندوستان میں جا آباد ہوا۔ للّو لال جی کی ابتدائی تعلیم اور تربیت بھی شمالی ہند ہی میں ہوئی۔ للّو سنسکرت کے بڑے عالم فاضل تھے۔ ہندی اور کھڑی بولی پر بھی سیر حاصل عبور تھا۔ ان کے تبحر علمی سے متاثر ہو کر کالکتان فورٹ ولیم کالج نے انھیں ملازم رکھ لیا اور تالیف و ترجمے کا کام تفویض ہوا۔ للّو لال جی نے فورٹ ولیم کالج میں رہ کر کئی ایک کتابوں کے ترجمے کئے اور انھیں سنسکرت سے نثر ہندی میں لکھا۔ ۱۸۰۳ء میں للّو لال جی نے بھگوت گیتا کے ایک باب کا سنسکرت سے نثر ہندی میں ترجمہ کیا۔ ہندی ادب کی تاریخ میں یہ ترجمہ جس کا نام انھوں نے "پریم ساگر" رکھا بنیادی کتاب کی حیثیت رکھتی ہے۔ کیونکہ اس سے پہلے نثر ہندی میں کوئی ایسی کتاب نہیں ملتی جس کی عبارت عام فہم ہو اور شمالی ہند میں اس وقت کثرت سے بولی جاتی ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ فورٹ ولیم کالج میں رہتے ہوئے للّو لال جی نے ہندی نثر کے لیے جو کام کیا اسے ہندی ادب کی تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکے گی۔ "پریم ساگر" للّو لال جی سے پہلے بھی ہندی زبان میں ترجمہ ہوئی تھی مگر اس میں سنسکرت کے الفاظ بڑی کثرت سے استعمال کئے گئے تھے۔ للّو لال جی نے اپنے ترجمے میں بڑی صاف اور کھڑی بولی لکھی اور سنسکرت کے محاوروں کو اس میں سے نکال دیا۔

"پریم ساگر" کی نثر کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

"یہ سنتے ہی کنس ڈر کر کانپ اٹھا اور کرودھ کر (غصہ کر) دیوکی کو جھونٹے پکڑ رتھ سے نیچے کھینچ لیا۔ کھڑگ (تلوار) ہاتھ میں لے، دانت پیس پیس لگا کہنے۔ جس پیڑ کو جڑ ہی سے اکھاڑئے تس پھل پھول کاہے کو لگے گا۔ اب اسی کو ماروں تو بے فکر راج کروں۔ یہ دیکھ سن باسو دیو من ہی کہنے لگا۔ اس مورکھ (بے وقوف) نے دیا سنتاپ (رنج) جانتا نہیں ہے پن اور پاپ جو میں اب کرودھ کرتا ہوں تو کاج بگڑے گا۔ تس سے اس سمے چھما کرنی یوگ (بھلی) ہے ——"

سنگاسن بتیسی یوں تو للّو لال جی نے اپنے قیام فورٹ ولیم کے دوران بہت سی کتابیں تحریر کیں جن میں راج نیتی۔ لطائف ہندی منظوم کہانی مادھو بلاس اور سبھا بلاس وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ لیکن ان کا سب سے نمایاں کارنامہ سنگاسن بتیسی ہے۔ یہ کتاب اردو میں بھی لکھی گئی جس میں ہندی عربی اور فارسی کے الفاظ کثرت سے استعمال کئے گئے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ انھوں نے بیتال پچیسی کے ترجمے میں بھی مظہر علی ولا کی بڑی اعانت کی۔ سب سے پہلے سنگاسن بتیسی کی نثر کا ایک اقتباس درج کیا جاتا ہے۔

"برہمن کہنے لگا۔ جب تلا لگن آوے جو اس میں مندر اٹھا دے۔ جب تک وہ لگن رہے کام اس میں جاری رکھے۔ اور جب تلا لگن ہو چکے تب اس کا کام موقوف کر دیوے۔ اس طرح تلا لگن میں ہی وہ سارا مکان تیاری پہ لاوے۔ اس کا اٹوٹ بھنڈارہ ہو اور کبھی اس کے یہاں سے کبھی نہ جاوے۔ یہ بات سن کر راجہ من میں خوش ہوا۔ دیوان کو بلایا اور مندر اٹھانے کی اجازت دے دی۔ کہ تم اچھی جگہ ڈھونڈ کر محل بناؤ۔ اتنے میں تلا لگن بھی آن پہنچی۔ اس مندر کی نیو دی۔ دیس دیس میں آوازہ ہوئی کہ راجہ تلا لگن میں محل بنواتا ہے۔ جتنے کاریگر اس میں کام کرتے تھے۔ سب اٹھ کر تلا لگن میں بناتے تھے۔ کہیں کام اس میں سونے کا اور کہیں روپے کا اور کہیں لوہے کا اور کہیں کاٹھ کا نئی نئی طرح سے بنتا تھا ——"

• • •

مرزا جان طپش

حالات و تالیفات مرزا جان طپش کا تعلق بھی ان کے دوسرے ہم عصر ادبا اور علما ادب کی طرح فورٹ ولیم کالج سے ہی تھا۔ نام مرزا جان تھا۔ طپش تخلص کرتے تھے۔ فارسی عربی اور سنسکرت و

ہندی کے عالم تھے۔ شاعری کا بھی بہت شوق رہا تھا۔ اگرچہ ان کی جوانی کے دور کی غزلیں ناپید ہیں لیکن اس عہد کے شعرا کے تذکروں میں طپشؔ کا نام بھی آتا ہے۔ ان کی غزلوں کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ ان کی طبیعت تصوف کی طرف مائل تھی۔ شاید اسی وجہ سے انہوں نے شاعری میں خواجہ دردؔ کے آگے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ مرزا جان کے نام سے زیادہ مشہور تھے۔ ان کی ولادت دہلی میں ۱۷۶۸ء میں ہوئی۔ دہلی سے نکل کر وہ لکھنؤ چلے گئے۔ لکھنؤ میں جی نہ لگا تو بنگال کا سفر اختیار کیا اور ڈھاکہ میں نواب شمس الدولہ سید احمد علی خان کے دربار سے منسلک ہو گئے۔

نواب شمس الدولہ کے زیرِ سرپرستی انہوں نے ایک لغت اردو محاورات کی مرتب کی جس کا نام "شمس البیان فی مصطلحات ہندوستان" ہے۔ یہ لغت ۱۷۹۳ء میں چھپی۔ یہ کتاب بعد میں مرشد آباد سے بھی چھپی۔ اس لغت میں اردو محاوروں کے فارسی میں معنی لکھے ہیں۔ ساتھ ساتھ اردو کا ایک شعر بھی درج کر دیا گیا ہے۔ مثلاً۔

"رفو چکر میں آنا۔ حیران ماندن بہ مشاہدہ امر عجیب و عوام بازاری استعمال کنند۔ سراج الدین سراجؔ دکنی گوید ؎

رفوگر کو کہاں طاقت کہ زخم عشق کو ٹانکے
اگر دیکھے میرا سینہ رفو چکر میں آجاوے

انگاروں پہ لوٹنا۔ کنایہ از بے قراری کہ در عالم رشک لاحق گردد۔ ولیؔ دکنی گوید ؎

شعلہ خو جب سے نظر آتا نہیں
تب سے انگاروں پہ لوٹے ہے ولیؔ

اپنے فورٹ ولیم کالج کے قیام کے دوران ہی طپشؔ نے اپنی غزلیات کا ایک دیوان بھی چھپوایا۔ علاوہ ازیں ایک مثنوی بھی لکھی جس کا نام "بہار دانش" رکھا ــــــ

• • •

تصنیفات بیرون فورٹ ولیم کالج

فورٹ ولیم کالج میں جب ۱۸۰۳ء میں دارالترجمہ قائم ہوا تو ساتھ ہی چھاپہ خانہ بھی لگ گیا جس میں کتابیں چھپنا شروع ہو گئیں۔ اس کے برعکس دلّی میں کالج سے باہر ۱۸۳۷ء میں چھاپہ خانہ قائم ہوا اور کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس اعتبار سے فورٹ ولیم کالج کے باہر جن مصنفین اور مؤلفین نے علم و ادب پر کام کیا ان کی کتابوں کو قبولیت عام کا درجہ نصیب نہ ہو سکا۔ بلکہ یوں کہنا زیادہ بہتر ہوگا کہ ان کی کتابیں عامۃ الناس تک نہ پہنچ سکیں۔ جبکہ فورٹ ولیم کالج کے باہر بھی بعض مصنفین تصنیف و تالیف کے کام میں لگے ہوئے تھے۔ مگر چونکہ انہیں طباعت و اشاعت کی سہولتیں میسر نہ تھیں اس لئے ان کا دائرہ کار محدود رہا۔ فورٹ ولیم کالج میں جب چھاپہ خانہ لگ گیا تو اس کے کچھ دیر بعد تک بھی باہر کے مصنفین وغیرہ کی کتابیں قبول عام کا درجہ حاصل نہ کر سکیں۔

مفتی انتظام اللہ شہابی اکبرآبادی نے اپنی تصنیف "یوپی میں اردو" میں مصنفین بیرون کالج کی ایک فہرست دی ہے جسے ہم ان کے مضمون سے یہاں نقل کر رہے ہیں۔

۱۔ ۔ ی ہر پرشاد سنبھلی مصنف بدائع الفنون (۱۷۳۳ء)
۲۔ ندرابن متھرادی (۱۷۵۷ء) مصنف تذکرۂ معاصرین۔
۳۔ مد حسین کلیم دہلوی (۱۷۵۴ء) مترجم فصوص الحکم۔
۴۔ ند علی شاہ قادری (۱۷۷۶ء) مصنف رسالہ تصوف۔
۵۔ ۔ وی قدر عالم بن مولوی بدر عالم (۱۸۰۷ء) مصنف فقہ محفوظ خانی۔
۔ خیم محمد شریف خان دہلوی (۱۸۰۰ء) مترجم قرآن مجید۔
۔۔ محمد جعفر مصنف روح الایمان واسلام (۱۷۸۹ء)
۸۔ مولوی کریم الدین دہلوی مترجم تاریخ ابی الفداء (۱۸۰۰ء)
۹۔ مولوی حافظ احمد مصنف سراج ایمان (۱۸۰۰ء)
۱۰۔ مولوی محمد رضا مصنف زاد آخرت (۱۸۰۲ء)
۱۱۔ مولوی حافظ محمد علی مصنف راہِ نجات (۱۸۰۳ء)
۱۲۔ مولوی محمد حیات مصنف معراج الحیات (۱۸۰۶ء)
۱۳۔ مولوی عبدالقادر مصنف گلشنِ دین (۱۸۱۲ء)
۱۴۔ مولوی محمد خالق اکبرآبادی مصنف مخزن الفوائد (۱۸۱۳ء)
۱۵۔ مولوی ولی محمد مصنف میخانۂ وحدت (۱۸۲۰ء)
۱۶۔ مولوی قادر بخش پانی پتی مصنف مختصر التجوید (۱۸۲۹ء)

مندرجہ بالا مصنفین کا تعلق فورٹ ولیم کالج سے نہیں تھا۔ اب ان میں سے اُن اصحاب کے بارے میں مختصر تعارف پیش خدمت ہے جن کے حالات میسر آسکے۔

محمد حسین کلیم دہلوی

محمد حسین کلیم دہلوی کا تذکرہ ہمیں میر حسن کے تذکرۂ شعرا میں بھی ملتا ہے۔ ان کے بارے میں میر حسن لکھتے ہیں کہ شاعر تھے اور نثر بھی خوب لکھتے تھے۔ انہوں نے فصوص الحکم کا اردو زبان میں بڑا بلیغ ترجمہ کیا۔ محمد حسین کلیم میر حسن کے ہم عصر تھے۔ میر حسن کا انتقال ۱۷۸۶ء میں یعنی محمد حسین کلیم کے انتقال سے کچھ سال پہلے ہو گیا تھا۔ محمد حسین کلیم کی نثر زیادہ تر اس زمانے کے مطابق مقفیٰ تھی۔

حکیم شریف خان دہلوی

حکیم شریف خان دہلوی کے جدِ امجد بابر بادشاہ کے ساتھ ہندوستان میں وارد ہوئے۔ انہوں نے شروع شروع میں حیدرآباد دکن کو اپنا مسکن بنایا۔ کچھ عرصہ دکن میں آباد رہے۔ پھر حکیم شریف خان کے دادا حکیم محمد واصل نے دکن سے ہجرت کی اور آگرہ شہر کو آکر اپنا وطن بنا لیا۔ اور وہ شہنشاہ اورنگ زیب کے شاہی طبیب مقرر ہوئے۔ حکیم محمد شریف خان کا سلسلۂ نسب حضرت خواجہ عبید اللہ احرار رحمۃ اللہ علیہ سے جا ملتا ہے۔ اور یہ مُلّا علی داؤد کی اولاد میں سے تھے۔ حکیم صاحب کے دادا واصل خان شاہ علیم اللہ کے خلیفہ بھی تھے۔ ان کے پسر کا نام محمد اکمل خان تھا جو ۱۷۱۹ء میں دہلی کے بادشاہ محمد شاہ کے خاص معالج مقرر ہوئے۔ انہیں بادشاہ نے "حاذق الملک" کا خطاب دیا۔ حکیم محمد شریف خان ان کے بیٹے تھے جن کی پیدائش دہلی ہی میں ۱۷۲۴ء میں ہوئی۔ حکیم شریف خان اپنے وقت کے نامی گرامی حکیم تھے اور انہیں دوسرا "بوعلی سینا" کہا جاتا تھا۔ مریض کے چہرے کو دیکھ کر مرض کی تہہ تک پہنچ جاتے تھے۔ تحصیل علم انہوں نے اپنے والد سے کی۔ متبحر عالم تھے۔ یہ دور شاہ عالم کا دور تھا۔ حکیم شریف خان شاہ عالم بادشاہ کے درباری طبیب مقرر کئے گئے۔ شاہ عالم نے انہیں "اشرف الحکما" کے خطاب سے نوازا۔ حکیم صاحب نے ۱۷۷۹ء میں حدیث شریف کی مشہور کتاب "مشکوٰۃ" کا فارسی

پھر ترجمہ کیا اور نام "کاشف المشکوٰۃ" رکھا۔ آپ کی زندہ اور یادگار کتابوں میں سے "شرح آثار نبوت" حاشیۂ نفیسی اور شرح حمد اللہ بہت مشہور ہیں۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ قرآن حکیم کا اردو زبان میں ترجمہ ہے۔ یہ ترجمہ حضرت شاہ عبدالقادرؒ دہلوی کے اردو ترجمہ سے بیس برس پہلے کیا گیا۔ حکیم صاحب کا ترجمہ آج تک زیورِ طبع سے آراستہ نہ ہو سکا۔

حکیم صاحب کا ۱۸۰۷ء میں انتقال ہوا۔

سید انشا اللہ خان دہلوی

سید انشا اللہ خان انشاؔ دہلوی نابغہ روزگار تھے ان کے جد امجد ایران سے کشمیر میں جا کر آباد ہو گئے تھے۔ وہاں سے ترک وطن کر کے دہلی میں آکر بس گئے۔ انشا اللہ خان کے والد کا نام حکیم ماشا اللہ خان تھا۔ اور وہ شاہی طبیب تھے۔ دہلی پہ تباہی و بربادی نازل ہوئی تو ماشا اللہ خان وہاں سے نقل مکانی کر کے بنگال چلے گئے اور مرشد آباد کو اپنا مسکن بنایا۔ اسی شہر مرشد آباد میں انشا اللہ خان پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم انہوں نے مرشد آباد ہی میں اپنے والد صاحب سے حاصل کی عین جوانی کے عالم میں دہلی آگئے۔ یہاں شاہ عالم کے دربار سے منسلک ہو گئے لیکن سیاسی اکھاڑ پچھاڑ سے گھبرا کر لکھنؤ کا رخ کیا۔ اس وقت لکھنؤ میں نواب سعادت علی خان کے دربار میں بڑے بڑے نامور لوگ جمع تھے۔ انشا اللہ خان بھی اسی دربار سے وابستہ ہو گئے۔ چونکہ بڑے بذلہ سنج شگفتہ گو اور عالم تھے اس لئے بہت جلد نواب سعادت علی خان کے دوست خاص کا درجہ حاصل کر لیا۔ لیکن انشا اللہ خان کی بے باکی کلام نے انہیں نواب صاحب کا دشمن بنا دیا اور وہ دربار سے نکل آئے۔

انشا اللہ خان کے شعری معرکوں کا ذکر حصہ شعر میں مناسب مقام پر تفصیل کے ساتھ کیا جائے گا۔ اس وقت ہمیں صرف ان کے نثر کے بارے میں لکھنا ہے۔ انشا اللہ خان انشا کی نثری تصانیف میں رانی کیتکی اور کنور اودے بھان کی کہانی اور دریائے لطافت بہت مشہور ہیں۔

رانی کیتکی اور کنور اودے بھان کی کہانی۔

انشا اللہ خان انشا کی یہ ایک نادر روزگار تصنیف ہے۔ ساری تصنیف شروع سے آخر تک پڑھ جائیے کہیں کسی جگہ بھی کوئی ایک لفظ یا ترکیب فارسی عربی کی نہیں ملے گی۔ انشا کی یہ تصنیف ان کی شوخ طبع اور ذہانت کی انمول مثال ہے۔ شروع میں لکھتے ہیں۔

"ایک دن بیٹھے بیٹھے اپنے دھیان میں یہ بات چڑھ آئی کہ کوئی کہانی ایسی کہیئے جس میں ہندوی چھٹ اور کسی بولی سے پٹ نہ ملے۔ تب جا کے میرا جی پھول کی کلی کے روپ سے کھلے۔ باہر کی بولی اور گنواری کچھ اس کے بیچ نہ ہو۔ اپنے ملنے والوں میں سے ایک کوئی پڑھے لکھے پرانے دھرانے بوڑھے گھاگ یہ کھٹراگ لائے سر ہلا کر منہ بنا کر ناک بھوں چڑھا کر آنکھیں پھرا کر کہنے لگے یہ بات ہوتی دکھائی نہیں دیتی۔ ہندوی پن بھی نہ نکلے اور بھاکا پن بھی نہ ٹھوس جائے۔ جیسے بھلے لوگ اچھوں سے اچھے آپس میں بولتے چالتے ہیں جوں توں وہی ڈول رہے اور چھاؤں کسی کی نہ پڑے، یہ نہیں ہونے کا۔ میں نے ان کی ٹھنڈی سانس کی پھانس کا ٹھوکا کھا کر جھنجھلا کر کہا۔ میں کچھ ایسا بڑبولا نہیں جو رائی کو پربت کر دکھاؤں اور جھوٹ سچ بول کے انگلیاں نچاؤں اور بے سری بے ٹھکانے کی الجھی سلجھی باتیں سناؤں۔ جو مجھ سے نہ ہو سکتا تو بھلا یہ بات منہ سے کیوں نکالتا، جس ڈھب سے ہوتا اس کے بکھیڑے کو ٹالتا۔ اب اس کہانی کا کہنے والا یہاں آپ کو جتاتا ہے اور جیسا کچھ لوگ اسے پکارتے ہیں کہہ سناتا ہے۔ داہنا ہاتھ منہ پر پھیر کر آپ کو جتاتا ہوں جو میرے داتا نے چاہا تو وہ تاؤ بھاؤ اور آؤ جاؤ اور کود پھاند اور لپٹ جھپٹ دکھاؤں جو دیکھتے ہی آپ کے دھیان کا گھوڑا جو بجلی سے بھی چنچل، اچھلاہٹ میں ہرنوں کے روپ میں ہے اپنی چوکڑی بھول جائے ؎

گھوڑے پر اپنے چڑھ کے آتا ہوں میں
کرتب جو ہیں سو سب دکھاتا ہوں میں
اس چاہنے والے نے جو چاہا تو ابھی
کہتا جو ہوں کر دکھاتا ہوں میں

اب سید انشا اللہ خان انشا کی کہانی رانی کیتکی میں سے ایک اقتباس نمونے کے طور پر پیش ہے تاکہ سید انشا کی نثر کا کچھ اندازہ ہو سکے۔

نمونۂ نثر

"ایک رات رانی کیتکی نے اپنی ماں کام لتا سے جھلاوے میں ڈال کے یہ پوچھا۔ گرو جی گسائیں مہندر گر نے جو بھبھوت باپ کو دیا تھا وہ کہاں رکھا ہے اور اس سے کیا ہوتا ہے۔ اس کی ماں نے کہا۔ میں تیرے واری تو کیوں پوچھتی ہے؟ رانی کیتکی کہنے لگی۔ آنکھ مچولی کھیلنے کے لئے چاہتی ہوں۔ جب سہیلیوں کے ساتھ کھیلوں اور چور بنوں تو کوئی مجھ کو پکڑ نہ سکے۔ رانی کام لتا نے کہ۔ وہ کھیلنے کے لئے نہیں ہے۔ ایسے لٹکے کسی بُرے دن کے سنبھال لینے کو ڈال رکھتے ہیں۔ جانے کوئی گھڑی کیسی ہے، کیسی نہیں۔ رانی کیتکی اپنی ماں کی اس بات سے اپنا منہ تھتھا کے اٹھ گئی اور دن بھر بن کھائے پیئے پڑی رہی۔ مہاراج نے جو پوچھا تو کہا مجھے رچ (بھوک) نہیں ہے۔ تب رانی کام لتا بول اٹھیں۔

اجی تم نے سنا بھی، بیٹی تمہاری آنکھ مچولی کھیلنے کے لئے وہ بھبھوت گرو جی کا دیا ہوا مانگتی تھی۔ میں نے نہ دیا اور کہا۔ بیٹی یہ لڑکپن کی باتیں اچھی نہیں، کسی برے دن کے لئے گرو جی دے گئے۔ اسی پر مجھ سے روٹھی ہے۔ بہتیرا بہلاتی پھسلاتی ہوں، مانتی نہیں۔ مہاراج نے کہا۔ بھبھوت تو کیا مجھے تو اپنا جی بھی اس سے پیارا نہیں، اس کی ایک گھڑی بھر کے بہل جانے پر ایک جی تو کیا، لاکھ جی ہوں تو دے ڈالیے، رانی کیتکی کو ڈبیا میں سے تھوڑا سا بھبھوت دیا۔"

دریائے لطافت

سید انشا کی اس نادر تصنیف کا تعلق اردو زبان و ادب کے قواعد سے ہے۔ اس تصنیف کے دو حصے ہیں۔ پہلا حصہ سید انشا کی تصنیف ہے جو کہ فارسی زبان میں ہے اور اردو زبان کے قاعدوں اور محاورات کے بارے میں ہے۔ کتاب کا دوسرا حصہ محمد حسن قتیلؔ کا لکھا ہوا ہے اور اس کا تعلق منطق، عروض اور علم المعانی سے ہے۔ یہ کتاب ۱۸۰۷ء میں ترتیب دی گئی اور پہلی بار ۱۸۵۲ء میں مرشد آباد کے مطبع آفتاب عالمتاب میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد یہ کتاب انجمن ترقی اردو کی جانب سے ۱۹۱۶ء میں بہ اہتمام مولوی عبدالحق شائع ہوئی۔ اس ایڈیشن میں مولوی صاحب کا ایک مقدمہ بھی ساتھ منسلک ہے۔ مولوی صاحب نے اس کتاب کے پہلے حصے میں سے وہ فقرے خارج کر دیئے ہیں جو مولوی صاحب کے نزدیک فحش تھے اور جنہیں سید انشا نے لکھا تھا۔ مولوی عبدالحق اس کتاب کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"اگرچہ اس کتاب سے پہلے بعض اہل یورپ نے متعدد کتابیں اردو قواعد

پر لکھی تھیں۔ لیکن یہ پہلی کتاب ہے جو ایک ہندی اہل زبان نے اردو صرف و نحو پر لکھی ہے اور حق یہ ہے کہ عجیب جامع اور بے مثل کتاب ہے۔ اردو زبان کے قواعد، محاورات اور روزمرہ کے متعلق اس سے پہلے کوئی ایسی مستند اور محققانہ کتاب نہیں لکھی گئی۔ جو لوگ اردو زبان کا محققانہ مطالعہ کرنا چاہتے ہیں یا اس کی صرف و نحو یا لُغت پر کوئی محققانہ تالیف کرنا چاہتے ہیں ان کے لئے اس کا مطالعہ ضروری ہی نہیں بلکہ ناگزیر ہے۔"

آگے چل کر اس کتاب کے تبصرے باب کے بارے میں مولوی عبدالحق لکھتے ہیں:

"اسی باب میں نواب عماد الملک، بھاڑا مل، مرزا صدر الدین صفاہانی اور ملّا عبدالغرقان کی دلچسپ تقریریں ہیں، خاص کر بی نورن اور میر غفر غلینی کی تقریریں نہایت پُرلطف ہیں۔ بی نورن اور میر غفر غلینی کی تقریر ایسی پاک صاف شستہ ہیں کہ آج کل کی بول چال بھی اس سے زیادہ فصیح نہیں ہو سکتی۔ اس سے سید انشاؔ کی زباندانی اور فصاحت کلام کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ باوجود اس قدر زمانہ گزرنے کے اور زبان کے منجھنے اور ترقی پانے کے وہ جو کچھ لکھ گئے ہیں اس میں کہیں حرف گیری کا موقع نہیں۔ بلکہ ویسی فصیح اور پاک صاف اردو اب بھی ہر شخص نہیں لکھ سکتا اور اس میں شعرائے عصر کے کلام پر جو تنقید کی ہے وہ بہت ظریفانہ ہے۔ یہاں تک کہ اپنے آپ کو بھی نہیں چھوڑا۔"

نمونہ نثر کلام بی نورن کسبی باشندۂ کوچہ بلاقی بیگم۔

"اجی او میر صاحب! تم تو عید کا چاند ہو گئے۔ دلّی میں آتے تھے دو دو پہر رات تک بیٹھتے تھے اور ریختے پڑھتے تھے۔ لکھنؤ میں تمہیں کیا ہو گیا کہ کہیں تمہارا اثر آثار معلوم نہ ہوا۔ ایسا نہ کیجیو، کہیں آٹھوں میں بھی نہ چلو۔ تمہیں علیؑ کی قسم آٹھوں میں مقرر چلیو۔"

جواب میر غفر غلینی دیالی۔

"اجی بی نورن! یہ کیا بات فرماتی ہو۔ تم تو اپنے جیوڑے کی چین ہو۔ پر کیا کہیں جب سے دلّی چھوڑی ہے کچھ جی افسردہ ہو گیا ہے اور شعر پڑھنے کو جو کہو تو کچھ لطف اس میں بھی نہیں رہا کہ مجھ سے سنئے، ریختے میں استاد میاں ولی ہوئے۔ ان پر توجہ شاہ گلشن صاحب کی تھی۔ پھر میاں آبرو اور میاں ناجیؔ اور میاں حاتمؔ پھر سب سے بہتر مرزا رفیع السودا اور میر تقی صاحب، پھر حضرت خواجہ میر دردؔ صاحب بردا اللہ مرقدہٗ جو میرے بھی استاد تھے۔ وہ لوگ تو سب مر گئے اور ان کی قدردانی کرنے والے بھی جان بحق تسلیم ہوئے۔ اب لکھنؤ کے جیسے چھوکرے ہیں۔ ویسے ہی شاعر ہیں اور دلّی میں بھی ایسا ہی کچھ چرچا ہے۔ تخم تاثیر صحبت کا اثر سبحان اللہ! یہ کون میاں جرأت بڑے شاعر۔ پوچھو تو تمہارا اخاناں کس دن شعر کہتا تھا؟ اور رضا بہادر کا کونسا کلام ہے؟ اور دوسرے میاں مصحفیؔ کہ بالکل شعور نہیں رکھتے۔ اگر پوچھئے کہ ضرب زیدٌ عمراً کی ترکیب تو ذرا بیان کرو تو اپنے شاگردوں کو ہمراہ لے کر لڑنے آتے ہیں۔ اور میاں حسرتؔ کو دیکھو، اپنا عرق بادیان اور شربت انار بیچ چھوڑ کے شاعری میں آگے قدم رکھا ہے، اور میر انشا اللہ خان بچارے میر ماشا اللہ خان کے بیٹے، آگے پریزاد تھے، ہم بھی گھورنے کو جاتے تھے اب چند روز سے شاعر بن گئے ہیں، مرزا مظہر جان جاناں صاحب کے روزمرہ کو نام رکھتے ہیں، سب سے زیادہ ایک اور سنیئے کہ سعادت یار طہماسپ کا بیٹا انوری ریختہ آپ کو جانتا ہے، رنگینؔ تخلص ہے۔ ایک قصہ کہا ہے۔ اس مثنوی کا نام دل پذیر رکھا۔ رنڈیوں کی بولی اس میں باندھی ہے۔ میر حسن پر زہر کھایا ہے ہر چند اس مرحوم کو بھی شعور نہ تھا۔ بارے میر کی مثنوی نہیں کہی، اگویا سانڈے کا تیل بیچتے ہیں۔ بھلا اس شعر کو کیوں کر کہیئے۔ سارے دلّی لکھنؤ کے رنڈی سے لے کر مرد تک پڑھتے ہیں ؎

چلی واں سے دامن اٹھاتی ہوئی؛ کڑے کو کڑے سے بجاتی ہوئی

سو اس بچارے رنگینؔ نے بھی اسی طور پر قصہ کہا ہے۔ کوئی پوچھے کہ بھائی تیرا باپ رسالدار مسلّم! لیکن بچارا برچھی بجائے کا ہلانے والا، تیغ کا چلانے والا تھا تو ایسا قابل کہاں سے ہوا۔ اور کراہی پن جو بہت مزاج میں رنڈی بازی سے آ گیا ہے تو ریختہ کے تئیں چھوڑ کر ایک ریختی ایجاد کی ہے۔ اس واسطے کہ بھلے آدمیوں کی بہو بیٹیاں پڑھ کر مشتاق ہوں اور ان کے ساتھ اپنا منہ کالا کرے۔ بھلا یہ کلام کیا ہے ؎

میاں سے ہے کے پیسے ڈولی کہارو

"اور نچوڑی انگیا، اور نگوڑی انگیا اور مروڑی انگیا اور مرد ہو کے یوں کہے کہ

کہیں ایسا نہ ہو کم بخت میں ماری جاؤں

اور ایک کتاب بنائی ہے۔ اس میں رنڈیوں (عورتوں) کی بولی لکھی ہے۔"

مرزا محمد حسن قتیل نام پورا مرزا محمد حسن تھا۔ قتیلؔ تخلص کرتے تھے۔ ان کے آباد اجداد فرید آباد کی کھتری قوم سے تعلق رکھتے تھے۔ خود بھی غیر مسلم تھے۔ بعد میں فرید آباد میں ہی اسلام قبول کر لیا اور محمد حسن نام رکھا۔ ان کا پہلا نام دیوالی سنگھ تھا۔ مرزا قتیلؔ فارسی کے بڑے عالم تھے اور اسی زبان میں کئی ایک کتب بھی تصنیف کیں۔ سید انشا اللہ خان انشاؔ سے ان کی بڑی گہری دوستی تھی یہی وجہ ہے کہ "دریائے لطافت" کا آدھا یعنی معانی اور عروض کا حصہ انہوں نے قلمبند کیا۔ اودھ کے دربار سے وابستہ تھے۔ طبعیت انشاؔ کی طرح رنگین اور چلبلی تھی لیکن کبھی ایک حد سے آگے نہیں بڑھے۔ کتاب "دریائے لطافت" کے آدھے حصے میں عروض پر بحث کرتے ہوئے اپنے الفاظ بھی تراشے جیسے

فاعلن مفاعلین، فاعلن مفاعلین کی جگہ چت لگن پری خام، چت لگن پری خانم وغیرہ۔

ان کی فارسی کی کتب میں سے چار شربت، نہر الفصاحت اور دیوان بہت مشہور ہیں۔ انہوں نے منطق کی بعض اصطلاحوں کا اردو کے متبادل الفاظ میں بھی ترجمہ کیا جیسے

مربع	چوگردا	مثلث	تکڑا
موضوع	بول	محمول	بھرپور
نسبت	لاپیہ	قضیہ	بات
تسلسل	الجھاسوت	مطابقت	ٹھیک ٹھیک
دَور	ہیرپھیر	تصدیق	جوں کا توں وغیرہ

علم البیان کے بارے میں ہمیں اردو میں سب سے پہلے مرزا قتیلؔ کی تحریر ہی ملتی ہے۔ امام بخش صہبائی نے کتاب "حدائق البلاغت" بعد میں لکھی۔ ان کی نثر خود ایجاد کردہ تھی۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔

"سوائے ضلع مناسبت درمیان دو چیز مخالف یکدگر بہ یک لفظ بیان کندو آں را نسبتِ نام نہند۔ مثلاً اگر کسے بشیر سد کہ کنوے اور آتشبازی میں کیا

نسبت ہے ؟ باید گفت کہ "چرخی"۔ یا بپر سد کہ بندوق اور جہاجن اور فرنگی میں کیا نسبت ؟ باید گفت کہ "کوٹھی"۔ یا اینکہ شمشیر و پلٹن باہم چہ نسبت دارند؟ باید گفت "باڑھ"۔ یا با میانہ چوتڑ و دوپٹہ چہ نسبت است ؟ باید گفت کہ "گوٹ"۔"

ایک مثال ضلع کی جس میں دریائی جانوروں، کشتی اور دریاؤں کے نام ایہام کے طور پر آئے ہیں ملاحظہ ہو۔

"آپ کا بجرہ کچھ آج کھل گیا ہے، واللہ تمہاری بات پا کی بہت مشکل ہے ہمیں کل سوتا چھوڑ گئے۔ ہر چند ضعف نالی کی تو بھی رتھ میں جگہ ندی۔ ایک باکی رنڈی کے کہنے سے ہماری چاہ دل سے اٹھا دی۔

مثال ایک عبارت کی جس میں حرف "نون" غائب ہے۔

"جس کا جی چاہے ہمارے پاس آئے۔ گھر ہے اس کا اور جو کوئی آتا آتا یک بارگی رہ جائے تو ہم کو کیا غرض۔ اگر یہ چاہے کہ ہم سا بے لیاقت بھی کبھی کبھی آیا کرے تو یہ بات بہت مشکل ہے، اس واسطے کہ عاصی پُر از معاصی ایسا عہد کر بیٹھا ہے کہ اسی گوشہ ہا کے بیچ اس طرح جما رہے کہ اگر ہزار بار دورۂ کامل فلک ہشتم کا کہ جس کو خلق خدا کی کرسی کہتی ہے، سر پر گزر جائے تو بھی اس جگہ سے اٹھ کر جو ہٹ جائے تو اس دوسرے حجرے تک جاوے۔ سو بھی دیکھا چاہیئے۔ یہ بھی اس وقت کا ایک ذلیل قافیہ ہے۔"

ایک عبارت صفت موصل دو حرفی کی ملاحظہ ہو۔

"چوٹی کو کاجی کی لڑکی گویا کالی ناگن ہے۔ پر جب جی چاہے تب کاٹے ہے۔ جوجو خوبی حق نے کوکا صاحب کی لڑکی کو دی ہے شاید نوشابہ کو دی ہو تو دی ہو۔"

مرزا قتیل کے مکتوبات بھی ایک جگہ مدون ہو کر شائع ہوئے۔ انہیں ان کے شاگرد رشید خواجہ امداد الدین نے مدون کیا اور نام "معدن الفوائد" رکھا۔ یہ مکتوبات کا مجموعہ ۱۸۱۷ عیسوی میں شائع ہوا۔ ابتدائیہ کی حمد ملاحظہ ہو۔

"بہت بندگی اور بہت غلامی کے لائق وہ جناب ہے کہ اس کو خدائے برتر نے اپنا پیغمبر کیا۔ اور تمام فاضلوں اور عالموں اور آدمیوں کو اس کی امت کیا۔ سبحان اللہ اس بزرگ درگاہ کو دیکھنے والا ہوں کہ میری ہدایت کی راہ کا دکھلانے والا ہے اور سعادت کی منزل کا خضر ہے۔"

مرزا قتیل کا انتقال ۱۸۲۴ء میں ہوا۔

مولوی اسمٰعیل دہلوی

مولوی اسمٰعیل دہلوی مولوی سید احمد شہیدؒ کے مرید خاص تھے۔ سید احمد شہیدؒ بریلوی برصغیر پاک و ہند میں فرقہ وہابیہ کے بانی تھے اور کفار کے خلاف جہاد کرتے ہوئے بالا کوٹ کے مقام پر شہید ہوئے۔ مولوی اسمٰعیل دہلوی نے بھی اپنے مرشد کے ساتھ ہی اس جہاد میں جام شہادت نوش کیا۔ آپ ۱۷۸۳ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد گرامی کا نام شاہ عبد الغنی تھا اور دادا شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی تھے۔ آپ ایک عظیم دینی گھرانے کے فرد تھے اور خدمت اسلام کا جذبہ دل میں کوٹ کوٹ کر بھرا تھا ساری زندگی دین اسلام اور توحید ربانی کی تبلیغ و اشاعت کی۔ ابتدائی تعلیم شاہ عبد العزیزؒ اور شاہ عبد القادرؒ سے حاصل کی۔

مولوی صاحب نے کئی ایک کتابیں تصنیف کیں جن میں ایک کتاب "تقویۃ الایمان" کو شہرت خاص نصیب ہوئی۔ اس کتاب میں سے ایک اقتباس پیش خدمت ہے۔

"ہر خاص و عام کو چاہیئے کہ اللہ اور رسولؐ ہی کے کلام کو تحقیق کریں اور اسی کو سمجھیں اور اسی پر چلیں اور اسی کے موافق اپنے ایمان کو ٹھیک کریں۔ سو سننا چاہیئے کہ ایمان کے دو جزو ہیں۔ خدا کو خدا جاننا اور رسولؐ کو رسولؐ سمجھنا۔ اور خدا کو خدا سمجھنا اس طرح ہوتا ہے کہ اس کا شریک کسی کو نہ سمجھے اور رسولؐ کا رسولؐ سمجھنا اس طرح ہوتا ہے کہ اس کے سوائے کسی کی راہ نہ پکڑے۔ ایک بات کو توحید کہتے ہیں۔ اور اس کے خلاف کو شرک اور دوسری بات کو اتباع سنت کہتے ہیں۔ اور اس کے خلاف کو بدعت۔ سو ہر کسی کو چاہیئے کہ توحید اور اتباع سنت کو خوب پکڑے اور شرک و بدعت سے بہت بچے۔ کہ یہ دونوں چیزیں اصل ایمان میں خلل ڈالتی ہیں اور باقی گناہ ان سے پیچھے ہیں کہ وہ اعمال میں خلل ڈالتے ہیں۔

سید اعظم علی اکبر آبادی

سید اعظم علی اکبر آبادی آگرہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے نانا مولوی ولی محمد شہر کے ایک متبحر عالم اور نیک دل بزرگ تھے۔ انہوں نے مثنوی مولانا روم کی شرح بھی لکھی تھی۔ آپ کے والد کا نام مولوی ببر علی تھا۔ سید اعظم علی نے ابتدائی تعلیم اپنے نانا سے حاصل کی اور سرکاری ملازمت میں چلے گئے۔ یہ ملازمت چونگی محصول کی تھی۔ وہاں کی غیر ادبی فضا سے تنگ آکر آگرہ کے ایک کالج میں فارسی کے استاد مقرر ہو گئے۔ انہوں نے سکندر نامہ کا ترجمہ بھی کیا۔ ۱۸۲۴ء میں ایک کتاب "فسانۂ سرور افزا" اردو میں لکھی۔ ایک فارسی مثنوی بھی لکھی جس کا نام "اکسیر اعظم" تھا۔ مرزا غالب سے ان کی دوستی اور خط و کتابت بھی تھی۔ "فسانۂ سرور افزا" کے ابتدائیہ میں سے ایک اقتباس پیش خدمت ہے۔

"احسان ایسے بادشاہ عادل اور شہنشاہ باذل کا کہ جس نے واسطے عبادت و معرفت اپنی ذات کے انسان ضعیف بنیان کو تئیں تہہ خانہ ظلمات عدم سے نکال کر خلعت جواہر نگار حیات ابدی کا عنایت فرمایا۔ مقدور کس بشر کا ہے کہ زبان و بیان سے ادا کر سکے۔ اور شکر ایسے ہادی برحق و کریم مطلق کا کہ ایسے مشت خاک سراسر ناپاک کے تئیں تمامی مخلوقات و موجودات سے ممتاز و سرفراز کر کے نور عقل و شمع ایمان سے منور کیا۔ طاقت کس کی ہے جو ایک حرف اس دفتر بے پایاں سے بیان کرے ایسا خداوند حقیقی ہے کہ ہر ذی حیات کو بے رعایت سلسلہ طاعت و عبادت کے شام و صباح وظیفہ خوار نعمتوں بے قیاس کا رکھتا ہے اور عجیب رزاق مطلق ہے کہ مور سے مار تلک اپنے مائدہ فضل و نوال سے محروم و مایوس نہیں کرتا ہے۔"

مرزا رجب علی بیگ سرور

مرزا رجب علی بیگ کے سن پیدائش کے بارے میں عام طور پر محققین کا خیال ہے کہ وہ ۱۷۸۷ء عیسوی میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے اس سے پہلے ہم اردو داستان گوئی کے باب میں رجب علی بیگ کا حال تفصیل سے لکھ چکے ہیں۔ یہاں صرف بہ ضرورت تسلسل کے لئے ان کا ذکر آئے گا۔ آپ کے والد گرامی کا نام مرزا اصغر علی بیگ تھا۔ شعر بھی کہتے تھے موسیقی پر بھی کافی عبور حاصل تھا۔ شاعری میں آغا نوازش حسین کی شاگردی اختیار کی۔ اودھ کے نواب غازی الدین حیدر سے کسی بات پر چپقلش ہو گئی اور سرور کو لکھنؤ چھوڑ کر کانپور جانا پڑا۔ قدرت فسانۂ عجائب کی تخلیق کے لئے اسباب مہیا کر رہی تھی۔ کانپور میں ان کے ایک دوست حکیم اسد علی تھے انہوں نے سرور کو مشورہ دیا کہ وہ فسانۂ عجائب لکھے۔ چنانچہ جب یہ کتاب لکھی گئی تو اودھ کے تخت پر واجد علی شاہ متمکن تھے۔ وہ سرور کی تصنیف فسانۂ عجائب سے بہت متاثر ہوئے اور انہیں اپنے دربار میں درباری شاعر کی حیثیت سے پچاس روپے ماہوار کے وظیفے پر رکھ لیا۔ لیکن جلد ہی اودھ کی سلطنت پر زوال آگیا۔ واجد علی شاہ معزول ہو کر کلکتے چلے گئے۔ جنگ آزادی کی تباہ کاریوں میں سرور پر بڑا کڑا وقت

اُن پڑا۔ کچھ امن جمی ہوئی تو سرور کو بنارس کے راجہ نے اپنے ہاں بلالیا۔ اس کے بعد سرور الور اور ریاست پٹیالہ میں بھی رہے۔ رجب علی بیگ سرور نے ۱۲۸۶ھ میں بہ مقام بنارس وفات پائی۔

مرزا رجب علی بیگ سرور کی تصنیفات یہ ہیں۔ فسانہ عجائب۔ شررِ عشق۔ سرور سلطانی۔ شگوفہ محبت۔ گلزار سرور۔ شبستان سرور۔ انشائے سرور۔

سرور سلطانی یہ کتاب فردوسی کے شاہنامہ کے خلاصے بہ عنوان شمشیر خانی کا اردو ترجمہ ہے۔ اردو ترجمے کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

"رستم سہراب سے دو چار ہوا۔ آخر کار تہمتن نے نعرہ کیا۔ کوہِ دہاموں کا جگر پارہ کیا اور سہراب کا کمر بند پکڑ کے سر سے بلند کر کے زمین پر دے ٹپکا اور فوراً کمر سے خنجر آبدار نکال اس کے سینہ کو چاک کر دیا۔ سہراب نے آہِ سرد دل زخمی دپر درد سے کھینچی اور کہا افسوس مشتاق دیدار پدر، محروم و ناکام پسر دارِ پائیدار سے چلا۔ تہمتن شیر افگن نہ ملا۔ مگر اب تو مچھلی بن کر زیر قدم گاؤ زمین پناہ لے جائے گا یا اختر ہو کر فلک ہفتمیں پر اپنے تئیں چھپائے گا۔ میرا باپ کہیں منہ نہ موڑے گا۔ کسی طرح تجھ کو زندہ نہ چھوڑے گا۔ رستم نے پوچھا۔ اس کا کیا نام ہے۔ سہراب نے کہا رستم جہاں پہلوان ہے اور میری ماں دختر شاہ سمنگان ہے۔ یہ سنتے دنیا رستم کی نظر میں تاریک ہو گئی"۔

گلزار سرور اس کتاب کے سبب تالیف کے بارے میں خود رجب علی بیگ سرور نے ابتدائیہ میں لکھا ہے۔

"رجب علی بیگ سرور اپنی گزشتہ داستانِ حیرت بیان لکھتا ہے۔ بارہ سو چہتر ہجری شہر شعبان میں فلک نے وہ سامان کیا۔ گلزار لکھنؤ پر عین بہار میں خزاں آئی اس شعبدہ بازِ کہن نے نئی نیرنگی دکھائی۔ بے فکری اس جا کی دور دور مشہور تھی بقول مشہور لنگوٹی پھاگ کھیلتی تھی۔ فاقہ کشی میں ڈنڈ پیلتی تھی۔ اپنے زعم میں قیصر و فغفور تھی۔ ایسی چمک دمک ہوئی کہ حد سے گزر گئی۔ ہر کمال را زوال ہے فلک کو اجاڑنا اس کا نام و نشان بنا کے بگاڑنا منظور تھا۔ وگرنہ نہ بادشاہ کے دل میں نہ یہاں کی رعایا کے دل میں فتور تھا۔ حضرت واجد علی شاہ سلطان عالم نے نو برس شاہی کی۔ اس پر سرکار سے سرتابی نہ کی بلکہ خیر خواہی کی، قیصر باغ کو غیرتِ گلزار ارم بنایا تھا کیا لکھوں دن رات جو لطف اٹھایا تھا۔ خدا جانے کس کم بخت کی نظر اس شہر کو کھا گئی۔ امیر فقیر سب پر تباہی آ گئی۔ ہند میں فوج سرکار قدیم نمک خوار پیادہ اور سوار شامتِ اعمال سے پھر گئے۔ غربا سے امرا تک بلا میں گھر گئے۔ جا بجا شور و شر مچا یا قتل و غارت سے فساد ہوا۔ لچوں کا کیا بگڑا۔ ہندوستان اس بکھیڑے میں برباد ہوا۔ پہلے دہلی اجڑی۔ پھاٹک ٹوٹا۔ پھر لکھنؤ لوٹا۔ یہاں تک کہ بے چراغ ہوا"۔

فسانہ عجائب سرور کی یہ سب سے نمایاں اور مشہور کتاب ہے۔ سرور کو اسی کتاب سے شہرت دوام نصیب ہوئی۔ اگرچہ اس سے پہلے اسی انداز میں لکھی گئیں دو کتابیں یعنی تحسین کی نو طرز مرصع اور فضلی کی کربل کتھا کافی شہرت حاصل کر چکی تھیں۔ ان میں بھی قافیہ پیمائی اور عربی و فارسی تراکیب کی بھرمار ہے اور یہ اسی رنگ میں لکھی گئی تھیں۔ لیکن رجب علی بیگ سرور نے پرانے اسلوب سے تھوڑی بہت کنارہ کشی ضرور کی۔ اور درمیانی راستہ اختیار کیا چنانچہ انہوں نے کئی مقامات پر قافیہ پیمائی سے کام نہیں لیا اور گنجلک عبارت آرائی سے بھی احتراز کیا۔ فسانہ عجائب اس کے باوجود آج کے طالب علم کو ایک اجنبی اور غیر مانوس کتاب لگے گی۔ لیکن اگر ہم سرور کے عہد اور اس عہد کے انداز نگارش کو سامنے رکھیں تو ہمیں محسوس ہوگا کہ یہ اس عہد کی منفرد اور نمائندہ داستان تھی اور اس عہد میں یہی انداز مقبول تھا۔ سرور کے اسلوب میں کہیں کہیں پیچیدگی اور الجھن پیدا ہو جاتی ہے اور وہ اصل مفہوم کو پوری طرح واضح نہیں کر سکتے۔ مثلاً ایک مقام پر سردی کی شدت یوں بیان کرتے ہیں۔

"آتش رخسارِ گل شبنم نے بجھائی۔ باغ میں بھی جاڑے کی دہائی تھی۔ اوس برگ و بار کی صنعت پروردگار کی دکھاتی تھی مرصع کاری یک لخت نظر آتی تھی۔ دانہ ہائے اشک شبنم خواہ جڑے یا ریزے تھے، ہر شجر کے پتے اور شاخ میں الماس اور موتیوں کے آویزے تھے"۔

مگر ایک جگہ جب سرور واقعات کے تسلسل کے ساتھ اور نادر تشبیہات اور مقفی عبارت آرائی کے ساتھ اس منظر کو بیان کرتے ہیں تو اصل مفہوم سامنے آ جاتا ہے۔

"چلے کے جاڑے، کڑاکے کی سردی تھی گویا زمین سے آسمان تک یخ بھر دی تھی۔ سردی سے سب کا جی جلتا تھا۔ دم تقریر ہر شخص کے منہ سے دھواں دھار دھواں نکلتا تھا۔ زمانے کے کاروبار میں خلل تھا۔ ہر ایک دست در بغل تھا، ہر سنگ کے سینے میں آگ تھی۔ گواہ شرعی شرر تھا۔ لیکن سردی کی یہی لاگ تھی اور جاڑے کا ایسا اثر تھا کہ سلیں کی سلیں جمی پڑی تھیں۔ فولاد سے زیادہ کڑی تھیں"۔

سرور کو ہندی اور سنسکرت پر بھی کافی عبور حاصل تھا۔ چنانچہ جب بادشاہ کے ہاں لڑکے کی ولادت ہوتی ہے تو بادشاہ نجومی کو بلاتا ہے کہ شہزادے کی جنم پتری کھلوائی جائے اس مقام پر سرور پنڈتوں اور نجومیوں کی خاص اصطلاحی زبان لکھتے ہیں۔

"بہت سوچ بچار کے بعد نجومیوں نے عرض کی۔ مہاراج کا بول بالا، جاہ و حشم مرتبہ دو بالا رہے۔ ہماری پوتھی کہتی ہے بھگوان کی دیا سے شہزادہ کا چندرمان بلی ہے چھٹا سورج ہے جو گرہ ہے وہ بھلی ہے۔ دیگ تیگ کا مالک رہے۔ دھرم مورت یہ بالک رہے۔ جلد راج پر براجے۔ پرتھوی میں دھوم مچے۔ ایسی شادی رچے مگر پندرھویں برس مشتری بادھویں آوے گی۔ سنیچر پاؤں پڑے گا۔ ایک پنکھیرو سونے کے بران میں ہاتھ آئے گا۔ تریا کی کھٹ پٹ سے وہ بچن سناوے گا کہ راج پاٹ چھڑا دیس بدیس لے جائے گا۔ وگرہ میں شہزادہ پھنسے، کوئی پاس نہ پھٹکے، ساتھی چھٹیں، اپنے ڈیل سے ڈانواں ڈول رہے، پھر ایک سنکھ ٹھاکر کا سیوک کرپا کر کے راہ لگائے کوئی کلنکن سوجھی ہو کشت لگائے"۔

موازنہ سرور و سرشار جناب حامد حسن قادری اپنی کتاب داستان تاریخ اردو میں لکھتے ہیں۔

"اصل فسانہ میں کوئی جدت نہیں ہے۔ خلاف قیاس واقعات اور عجائبات جیسے اس سے پہلے داستان امیر حمزہ وغیرہ میں ہیں فسانہ عجائب میں بھی ہیں۔ فسانہ عجائب کا اس اعتبار سے مطالعہ کرنا ضروری ہے اور دلچسپ بھی کہ یہ داستانی ادب کا جزو ہے۔ اس سے پہلے کم اور اس کے بعد بڑی کثرت سے نہایت طویل و ضخیم کتابیں لکھی گئیں۔ ان داستانوں میں اس کا کیا درجہ ہے؟ پھر فسانہ عجائب کی تصنیف (۱۸۲۴ء) کے تقریباً چالیس برس بعد اردو میں جدید ناول نگاری کا دور شروع ہوا۔ سب سے پہلے ڈپٹی نذیر احمد نے ۱۸۶۹ء میں ناول مراۃ العروس لکھا اور پھر پے در پے متعدد ناول تصنیف کئے اور پھر پنڈت رتن ناتھ سرشار نے ۱۸۷۸ء میں "فسانہ آزاد" لکھا۔ ان ناولوں سے فسانہ عجائب کا کیا مقابلہ ہے؟
داستانوں میں فسانہ عجائب کو کوئی نمایاں مرتبہ حاصل نہیں ہے۔ اس کے بعد

الف لیلہ اور بوستان خیال اور داستان امیر حمزہ اور اس کے سلسلے میں ایک الماری بھری داستانیں لکھی گئیں۔ جن میں سے ایک ایک فسانہ عجائب سے کئی گنی بڑی ہے اور واقعات و نیرنگ و فسوں اور تجربات و مشاہدات کی انسائیکلوپیڈیا ہیں۔۔

ناولوں کی خصوصیات کے لحاظ سے بھی فسانہ عجائب کو کوئی درجہ نہیں دیا جاسکتا یعنی افراد، قصہ کا کردار، مربوط و مقرر پلاٹ، اشخاص کا مکالمہ، جذبات نگاری جدید ناول کے اصول سے مطابق نہیں ہیں۔ کہیں یہ اجزا درست ہیں۔ کہیں ناقص۔ مثلاً ملکہ مہر نگار کا کردار مہر و رفا، صدق و صفا ہمت و استقلال، دانائی و کاروانی صحیح طور پر پیش کیا ہے۔ فسانہ عجائب کا مقابلہ نذیر احمد، سجاد حسین، عبدالحلیم وغیرہ کے ناولوں سے تو ہو ہی نہیں سکتا۔ سرشار کے فسانۂ آزاد سے اس اعتبار سے مقابلہ کیا جاسکتا ہے کہ سرور نے اپنے کتاب کے دیباچہ میں اور سرشار نے اپنے فسانہ میں لکھنؤ کی معاشرت اور سوسائٹی اور تہذیب و تمدن کا حال دکھایا۔ لیکن سرور کی نقاشی ایسی ہے جیسی نمائش گاہ میں باتصویر پردہ جس پر بازاروں، مجلسوں، مجمعوں کی تصویریں صحیح کھینچی ہوئی ہوں۔ لیکن بالکل خاموش اور بے حس اور سرشار کی مصوری ایسی ہے جیسی متکلم سنیما کے پردے پر چلتی پھرتی بولتی چالتی تصویریں سرور مختصر طور پر سرسری بیان لکھتے ہیں سرشار چھوٹی چھوٹی باتوں کی تفصیل لکھتے ہیں۔ سرور قصہ اور اس کے عجائبات سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ سرشار قصہ کو چھوڑ دیتے ہیں بلکہ بھول جاتے ہیں اور افراد قصہ اور ان کے خصائص طبع و عجائب فطرت کو بیان کرتے ہیں۔ سرور میں شوخی و ظرافت کہیں نہیں اور سرشار میں شوخی و ظرافت ہر جگہ ہے۔

فسانہ عجائب کب لکھی گئی؟

فسانہ عجائب کے آغاز و اختتام تصنیف کے صحیح سال دریافت نہیں ہوئے۔ مرزا محمد عسکری نے تاریخ ادب اردو میں لکھا ہے کہ ۱۲۴۰ھ میں سرور کانپور گئے اور یہ سال سرور کی تحریر سے ثابت کیا ہے اس سے آگے لکھتے ہیں۔ کانپور ہی میں یہ کتاب لکھی گئی۔ یہ کتاب غازی الدین حیدر کے زمانہ میں شروع ہوئی تھی اور نصیر الدین حیدر کے عہد میں تمام ہوئی۔ اس کے بعد لکھتے ہیں۔ بعد اختتام بعہد نصیر الدین حیدر لکھنؤ میں آئی اس کا سنۂ تصنیف ۱۲۴۰ھ ہے جیسا کہ آخر کے قطعات تاریخ سے معلوم ہوتا ہے"

یہ بیانات نہایت غیر مطابق اور غیر ذمہ دارانہ ہیں اگر ان سنوں کو صحیح مان لیا جائے تو سرور جس سال کانپور گئے اسی سال کے اندر یہ کتاب لکھ لی۔ اور آخر میں اسی سال کے قطعات شامل کر لئے۔ یہ بالکل قرین قیاس ہے۔ لیکن ۱۸۲۴ء/ ۱۲۴۰ھ غازی الدین حیدر کے زمانے کا سال ہے۔ نصیر الدین حیدر کا عہد حکومت اس سے تین سال بعد یعنی (۱۲۴۳ھ بمطابق ۱۸۲۷ء) میں شروع ہوتا ہے۔ پھر اس کے لکھنے کے کیا معنی کہ نصیر الدین حیدر کے زمانے میں تمام ہوئی۔

فسانہ عجائب کا طویل نمونہ دینے کی ضرورت نہیں۔ نہایت مشہور و عام و رائج کتاب ہے۔ سکولوں اور یونیورسٹیوں کے نصاب تعلیم میں اس کے اقتباسات شامل ہیں۔ ایک مختصر ٹکڑا درج کیا جاتا ہے جس میں عربی فارسی کی لفاظی کم ہے۔ روزمرہ زیادہ ہے۔

"یہاں تو جیسی بیتی تھی کہ جان عالم تشریف فرما ہوا۔ عجیب صحبت دیکھی شہزادی کا چشم پُر آب با دل کباب غیظ میں آ، تھرتھرا، طوطے سے بحث رہی ہے۔ شہزادہ نے فرمایا: خیر باشد طوطا بولا آج تماشا ہے۔ خیر بخیر مگر چند سے حیات اس وحشی کی اور آب و دانہ قفس چینا کھانا باقی تھا۔ اگر آپ اور گھڑی بھر دیر لگاتے، تشریف نہ لاتے تو میرا طائر روح گربہ مجروح شہزادی سے مجروح ہو کر پرواز کر جاتا۔ ہرگز جیتا نہ پاتے، لگن پنجرا خالی دیکھ مزاج عالی پریشان ہوتا۔ بحسرت و افسوس یہ فرماتے ؎

طوطا ہمارا مر گیا کیا بولتا ہوا

ماہ طلعت ان باتوں سے زیادہ مکدر ہوئی شہزادے سے کہا۔ اگر میری بات کا طوطا جواب صاف نہ دے گا تو اس نگوڑے کی گردن مروڑ اپنے تلووں سے اس کی آنکھیں ملوں گی جب دانہ پانی کھاؤں پیوں گی۔ جان عالم نے کہا۔ کچھ حال تو کہو۔ طوطے نے گزارش کی حضور یہ مقدمہ غلام سے بیٹھے مجھ سے پھر فرمایا تو نے ایسی صورت کبھی دیکھی ہے؟ مجھ اجل رسیدہ کے منہ سے نکلا۔ خدا نہ کرے اس جرم قبیح پر شہزادی کے نزدیک کشتنی، سوختنی اگردن زدنی ہوں۔ جان عالم نے کہا۔ تم بھی کتنی عقل سے خالی حمق سے بھری ہو۔ تم تو پری ہو۔ جانور کی بات پر اتنا آزردہ ہو گویا ہے پھر طائر ہے۔ میاں مٹھو کو ان باتوں کی تاب نہ آئی۔ آنکھ بدل روکھی صورت بنائی اور ٹیں سے بولا۔ خداوند نعمتا! جھوٹ جھوٹ ہے۔ سچ سچ ہے۔ میں نے تو جھوٹ اور سچ دونوں سے بچ کر ایک کلمہ کہا تھا۔ اگر راستی پر ہوتا گردن کج کئے سیدھا گور میں سوتا۔ یہ سن کے وہ اور مکدر ہوئی۔ مثل مشہور ہے۔ راج ہٹ، بالک ہٹ، تریا ہٹ۔ جان عالم نے مجبور ہو کر کہا جو ہو سو ہو۔ میاں مٹھو پیارے سچ کہہ دو"

محمد بخش مہجور

وطن دہلی تھا۔ میر اور سودا کے ہم عصر تھے۔ اس زمانے کے تمام علوم پر خاصا عبور حاصل تھا طبیعت شاعرانہ تھی۔ شروع شروع میں جرأت سے تلمذ حاصل رہا۔ ان کی نثر اس عہد کی مقفیٰ نثر تھی۔ ان کی کتاب "گلشن نوبہار" آج بھی یادگار کتاب سمجھی جاتی ہے۔ یہ اپنے عہد میں ابھر کر سامنے نہ آسکے۔ حامد حسن قادری صاحب نے ان کی کتاب "گلشن نوبہار" میں سے حمد باری تعالیٰ کی چند سطریں نقل کی ہیں۔

"حمد و سپاس و ثنائے بے قیاس۔ اس کریم کارساز، بے نیاز، بندہ نواز، بے چون و چگوں کو جس نے ساتھ ابر کرم اور بہار قدرت کے گل ہائے گوناگوں انسان ضعیف البنیان سے گلشن تکوین کو سرسبز و شاداب کر کے اپنے تئیں برنگ نکہت ہر غنچہ و گل میں جلوہ گر کیا۔ میاں جرأت کے بقول ؎

اسے دیکھو تو ہے ہر رنگ میں وہ — عیاں گل میں نہاں ہے سنگ میں وہ
وہ ہے ہر رنگ میں اور پھر جدا ہے — خدا ہے وہ، خدا ہے وہ، خدا ہے

نثر کا دور چہارم

قبل ازیں آپ نے اردو نثر کے دور سوم کے ان مصنفین کے بارے میں پڑھا جو فورٹ ولیم کالج سے متعلق رہ کر اور اس سے باہر رہ کر بھی اردو نثر کے لئے شب و روز کام کرتے رہے۔ نثر دور چہارم ان مصنفین کے تذکرے پر مشتمل ہے جن کا زمانہ غدر سے پہلے اور کچھ بعد کا ہے۔ یہ انیسویں صدی عیسوی کا نصف اول اور ذرا بعد کا ہے یعنی میر امن سے غالب کے ہم عصر نثر نگاروں تک اس اعتبار سے ۱۸۰۱ء سے لے کر ۱۸۷۰ء تک کا زمانہ بنتا ہے۔

سدا سکھ لال

اردو میں قانون کی پہلی کتاب ۱۸۰۳ء میں بعنوان "ہدایت نامہ مال گزاری" مرتب کی گئی۔ اردو ۱۸۳۲ء میں عدالتی اور سرکاری زبان قرار پائی تھی۔ لیکن اس سے بہت پہلے ہندوستان میں رہنے والوں کی آسانی کے لئے فوجداری دیوانی اور مال گزاری کے قوانین کا اردو میں ترجمہ شروع ہو چکا تھا۔ سدا سکھ لال نے ۱۸۴۴ء میں سپریم گورنمنٹ ایکٹ (مجموعہ قوانین) مرتب کیا۔ اسے مطبع نور الابصار آگرہ نے چھاپا تھا۔ اس کے دیباچے میں سدا سکھ لال لکھتے ہیں۔

"مدے اس تالیف کے ایسے نہیں ہیں کہ احتیاج ان کے بیان کی ہو۔ فی الواقع یہ جلدیں آئینہ نمائے انتظام جملہ سررشتہ ہائے سلطنت عظیم الشان سرکار دولت مدار انگلشیہ کی ہیں۔ ان کے دیکھنے سے بآسانی معلوم ہو سکتا ہے کہ ہر باب میں کتنے قوانین مجاریہ دقت ہیں اور کتنے منسوخ ہو گئے۔"

فقیر محمد گویا

نام فقیر محمد، حسام الدولہ خطاب اور گویا تخلص تھا۔ شعر گوئی کے معاملے میں ناسخ اور وزیر سے مشورہ کرتے تھے۔ لکھنؤ کے اُمرا میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ اودھ کے شہنشاہوں کے عہد میں کسی زمانے میں فوج میں رسالدار رہ چکے تھے انوار سہیلی کے ترجمے گویا بہت سے پہلے بھی کئے گئے تھے۔ انہوں نے ۱۸۲۵ء میں انوار سہیلی کا ترجمہ "بستان حکمت" کے نام سے کیا۔ نقادانِ فن کا خیال ہے کہ گویا کا ترجمہ فورٹ ولیم کالج کے منشی حفیظ الدین اور محمد ابراہیم بیجاپوری کے ترجمے سے کہیں بہتر ہے۔ گویا خود اپنے ترجمے کے دیباچے میں لکھتے ہیں۔

"اب سنا چاہیئے کہ ایک روز بندہ اور خواجہ وزیر اور میاں فرخ شاعر کہ یہ دونوں شاگرد ارشد شیخ ناسخ صاحب کے ہیں، اور چند احباب باہم بیٹھے ہوئے تھے اور وقت شغل انوار سہیلی کے مطالعے کا تھا اور اس کے مصنف کی فکروں پر سب نے زبان ثنا کھولی تھی کہ سبحان اللہ مصنف اس کا عجیب حکیم بے مثل تھا اور عجب کتاب تصنیف کی ہے کہ گنجینہ ہے اسرار الٰہی کا اور خزینہ ہے فیض غیر متناہی کا۔ بلکہ قرینہ اس پر دال ہے کہ جو کچھ اس نے بیان کیا ہے متلفنہ ہے کہ بامراد الہام غیبی ہو۔"

گویا کے ترجمے "بستان حکمت" کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

"بادشاہ نے حکم دیا کہ دمنہ کو دار القضا میں سپرد کرو تا قاضی اس کا حال دریافت کرے کہ احکام سیاست میں جب تک شرائط شرعی تمام نہ ہوں گے کچھ حکم نہ کیا جائے گا۔ دمنہ نے کہا کہ کون حاکم راست کار بادشاہ سے زیادہ ہے اور کون قاضی، عادل شہریار سے بالاتر ہے۔ الحمد للہ کہ ضمیر منیر بادشاہ آئینہ ہے باصفا، بلکہ جام ہے جہاں نما کہ صورت حال ہر ملازم و رعایا کی اس میں ہویدا ہے۔

اور بہ یقین آشنا جانتا ہوں کہ کشفِ شبہات اور رفع حجاب میں کوئی چیز برابر فراست بادشاہ جم جاہ کے نہیں ہے۔ اگر خود شہریار بہ نفسِ نفیس رائے جہاں آرا کو قاضی میرے حال کا فرمائے تو کذب اور صدق میرا مانند صبح صادق کے روشن ہو جائے شیر نے کہا۔ اے دمنہ! اندیشہ نہ کر کہ اس مہم میں جستجوئے عام کی جائے گی الا تحقیق اس کام کی اس طرح پر کہ زیادتی اس سے متصور نہ ہو عمل میں آئے گی۔

جدا کر لیں گے ہم اس طرح حق و باطل کو
کہ جیسے دودھ سے مکھی نکال لیتے ہیں
نکال لیتے ہیں جس طرح عطر پھولوں سے
ہر ایک بات کا ہم جی نکال لیتے ہیں

نیم چند کھتری

نیم چند کھتری نے "قصہ گل صنوبر" کا ترجمہ ۱۸۳۷ء میں کیا۔ یہ کتاب فارسی زبان میں لکھی گئی تھی۔ کھتری نے اس کا ترجمہ اردو میں کیا مولانا احسن مارہروی کی کتاب "نمونۂ منثورات" میں سے اس ترجمے کا اقتباس ملاحظہ ہو۔

"بعد ازاں فقیر حقیر رضائے الٰہی پر خرسند نیم چند یوں لکھتا ہے کہ اس عالم ناپائیدار میں کسی چیز کو قرار نہیں۔ اس کی ذات لازوال کے واسطے بقا اور باقی سب کو فنا ہے۔ مگر ایک گلستان سخن کہ خزاں جہاں اس کے گلوں پر نہیں آتی۔ چوروں کی چوری اور رہزنوں کی رہزنی سے یہ دولت کہیں نہیں جاتی۔ چمن اس کا ہمیشہ تازہ و خرم رہتا ہے اور اس کی نہروں میں زلال زندگی بہتا ہے۔ اس کی مکان کی نیو کو حادثے کے بھونچال کا کچھ خطرہ نہیں ہوتا۔"

نواب قطب الدین خان دہلوی

سرسید احمد خان نے "آثار الصنادید" میں نواب قطب الدین خان دہلوی کے بارے میں لکھا ہے کہ آپ کے اجداد والا تبار عالی خاندان والا دودمان تھے۔ ہمیشہ پیش گاہ سلطنت سے مناصب جلیلہ رکھتے تھے۔ اس زمان میں بھی آپ کو تقرب وحضرت سلطانی سے وہ عزت و جاہ حاصل ہے جو چاہیئے۔ چونکہ دل اپنے استاد کی پیروی اور خلق کی راہنمائی کے لئے مجلس وعظ منعقد فرماتے ہیں اکثر رسائل زبان ریختہ میں واسطے فوائد عوام کے تحریر کئے اور ان میں مسائل ضروریہ ہر طرح کے مندرج فرمائے اور حق یہ ہے کہ ان رسالوں سے خلق کو بہت فائدہ ہوا کہ ضروریات دین سے ہر شخص مطلع اور آگاہ ہو گیا۔

ظفر جلیل۔ یہ کتاب قاضی القضاۃ شمس الدین محمد دمشقی کی کتاب "حصن حصین" کا اردو ترجمہ ہے۔ یہ کتاب ۱۸۲۷ء میں تالیف کی گئی۔ اس کی نثر کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو۔

"حمد بے شمار ہے اس پاک پروردگار کے لئے کہ ہم کو توفیق دی اپنے ذکر کی اور راہ بتائی اپنے شکر کی، یا الٰہی درود و سلام بے حد نازل فرما خاتم النبیین شفیع المذنبین رسول امین پر اور ان کے اصحاب ابرار اور آل اطہار پر اور سب پر۔"

مظاہر حق۔ یہ کتاب "شرح مشکوٰۃ المصابیح" کا اردو ترجمہ ہے۔ یہ کتاب نواب قطب الدین خان دہلوی نے ۱۸۳۸ء میں ترجمہ کی۔ بقول مولانا حامد حسن قادری یہ کتاب قطب الدین خان کا بہت شاندار کارنامہ ہے اور چار جلدوں میں بڑی تقطیع کے دو ہزار صفحوں سے زیادہ پر طبع ہوا ہے۔ اردو زبان میں یہ سب سے پہلی جامع اور مکمل حدیث شریف ہے۔ اس کا حال خود مولانا قطب الدین دیباچہ میں لکھتے ہیں۔

"بعد اس کے مسکین محمد قطب الدین شاہجہان آبادی عرض کرتا ہے کہ کتاب مشکوٰۃ شریف علم حدیث میں عجب نافع کتاب ہے کہ ہر مضمون کی حدیثیں اس میں مندرج ہیں اس کا ترجمہ عدیم النظیر میرے استاد بزرگوار مولانا و مخدومنا و مکرمنا حضرت حاجی محمد اسحاق نواسہ حضرت شیخ عبد العزیز رحمہا اللہ تعالیٰ نے زبان ہندی کے بین السطور میں لکھا تھا لیکن کاتبوں سے اس کی صورت میں فرق آنے لگا۔ مرضی جناب موصوف کی ایسی پائی کہ اگر یہ بطور شرح کے لکھا جاوے بہتر ہے۔ اس لئے ہیچ مدان نے ترجمہ اس کا عبارت عربی سے علیحدہ کر کے لکھا اور فائدے مختصر مناسب مقام کے شروح مشکوٰۃ وغیرہ سے مثل مرقاۃ شرح ملا علی قاری اور ترجمہ حضرت شیخ عبد الحق اور حاشیہ سید جمال الدین رحمۃ اللہ علیہ کے اور سوائے ان کے سے زیادہ کر کے خدمت عالی میں عرض کی۔ اور جناب ممدوح نے بھی کچھ فائدے لکھے تھے۔ تبرکاً اس میں درج کئے اور نام اس کا مظاہر حق رکھا گیا کہ اس میں تاریخ اس کی نکلتی ہے۔

ذیل میں ترجمہ و فوائد کا نمونہ عربی کی حدیث شریف کو چھوڑ کر درج کیا جاتا ہے۔

"اور روایت ہے واثلہ بن اسقع سے کہا۔ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس شخص نے کہ طلب کیا علم۔ اور حاصل ہوا اس کو، ہوگا واسطے اس کے دوہرا ثواب۔ اور اگر نہ حاصل ہوا اس کو علم تو ہوگا واسطے اس کے ایک حصہ ثواب سے۔ روایت کی یہ دارمی نے ف۔ دوہرا ثواب، ایک ثواب طلب کا اور مشقت کا کہ تحصیل علم میں کھینچی ہے دوسرا ثواب حاصل ہونے علم کا اور پڑھانے کا اوروں کو، یا ثواب عمل کا علم پر کیا ہے۔ اور دوسرے کو ایک ثواب مشقت ہی کا ہوگا۔ بہر تقدیر طلب علم میں رہنا چاہیئے۔ اگر حاصل ہوا نور علی نور، و الّا طلب علم میں مرنا بھی سعادت ہے۔"

مفتی صدر الدین آزردہ

مفتی صاحب کی پیدائش دہلی میں ۱۷۹۸ء میں ہوئی۔ آپ کشمیری النسل تھے۔ والد صاحب کا نام مولوی لطف اللہ

تھا۔ آپ نے تحصیل علم مولانا شاہ عبدالقادر، مولانا شاہ عبدالعزیز، مولانا محمد اسحاق اور مولانا فضل حق خیر آبادی ایسے جید علما سے کی۔ انگریزی حکومت کی جانب سے صدر الصدور اور دہلی کے مفتی لگائے گئے۔ غدر کے زمانے میں ان پر جہاد کے فتوے کا الزام لگا۔ ساری جائیداد ضبط ہو گئی۔ عہدہ بھی گیا لیکن بعد میں یہ الزام بے بنیاد ثابت ہوا اور جائیداد کا وافر حصہ واپس مل گیا۔ سر سید احمد خان، نواب یوسف علی خان والئی رام پور اور صدیق حسن خان بھوپالی ان کے شاگردانِ رشید میں سے تھے۔ عربی فارسی کی تالیفات اور فتاوی ان کی یادگار ہیں۔ عربی، فارسی اور اردو میں شعر کہتے تھے۔ تخلص آزردہ تھا۔ شاہ نصیر، میر ممنون اور میاں جرم اکبر آبادی سے اردو میں مشورہ سخن کرتے تھے فارسی میں ایک تذکرہ اردو کے شعرا کا مرتب کیا۔ یہ تذکرہ اب نہیں ملتا۔ ۱۸۶۸ء میں راہی ملک عدم ہوئے۔ نواب مصطفیٰ خان شیفتہ، مرزا غالب اور امام بخش صہبائی سے بڑے گہرے مراسم تھے۔ ان سے اردو میں خط و کتابت کیا کرتے تھے ان کے ایک خط کی چند سطریں ملاحظہ ہوں۔

نامہ آزردہ بنام مصطفیٰ خان شیفتہ

"شکر ہے اس پروردگار عالم کا جس نے مجھ کو ایسی دلدل سے کہ ہمہ تن اس میں غرق اب تھا، نکالا، کیسے علائق میں جکڑ بند تھا کہ نکلنا اس سے سوائے ایسی صورت کے جو پیش آئی ممکن نہ تھا۔ مقدمات اصل کا فیصل کرنا، منصفوں اور صدر امینوں کے مقدمات کا مرافعہ سننا، رجسٹری کے وثائق پر دستخط کرنا، مقدمات دورہ میں فتویٰ دینا، کمیٹیوں میں حاضر ہونا، طلبہ مدرسہ سرکاری کا امتحان ماہواری لینا، احکام اخیر کو اپنے ہاتھ سے لکھنا، ہزاروں کاغذوں پر دستخط کرنا، پھر گھر میں آکر طالب علموں کو پڑھانا اور اطراف و جوانب کے سوالات شرعی کا جواب لکھنا، وہابیوں اور بدعتیوں کے جھگڑے میں حکم ہونا مجالس شادی و غمی اور اعراس میں جانا، شعر و شاعری کی صحبت کو گرم رکھنا، باغات کی سیر اور خواجہ صاحب کی زیارت کو اکثر جانا۔"

مفتی سعد اللہ رامپوری

ان کا اصل وطن مراد آباد تھا۔ مراد آباد ہی میں ۱۸۰۴ء میں پیدا ہوئے۔ مفتی صدر الدین آزردہ سے علم حاصل کیا بعد ازاں دہلی سے کوچ کر کے لکھنؤ گئے اور وہاں تکمیل علوم کے بعد شاہی مدرسے میں مدرس کی حیثیت سے تعینات ہوئے۔ لکھنؤ میں ۱۸۵۷ء تک رہے اس کے بعد رام پور چلے آئے نواب رام پور اور منشی امیر احمد مینائی ان کے شاگردوں میں سے تھے۔ سعد اللہ رامپوری کا انتقال ۱۸۷۶ء میں ہوا۔ امیر مینائی اپنی تصنیف "انتخاب یادگار" میں تحریر فرماتے ہیں۔

"جامعیت فضل و کمال میں مشہور آفاق، علم معقول و منقول میں طاق، طبیعت ہمہ گیر ہندوستان میں ہزاروں کے استاد۔ ان کی بہت سی تصنیفات ہیں۔ مطول و مختصر اکثر تالیفات ہیں ان میں بعض نا تمام ہیں۔ مولوی صاحب برسوں دہلی اور لکھنؤ میں رہے ایک مدت سے اس دار الریاست (رامپور) میں مکان بنوا لیا ہے۔ اہل و عیال سب یہیں ہیں۔ اب یہی مسکن ہے۔ مراد آباد سے کچھ علاقہ نہیں رہا یہی وطن ہے۔"

مفتی سعد اللہ رامپوری نے امام اعظمؒ کے رسالہ فقہ اکبر کا ۱۸۴۰ء میں اردو میں ترجمہ کیا۔ اس کا نمونہ پیش نظر ہے۔

"یہ کتاب ہے اصل توحید اور اعتقاد صحیح کے بیان میں واجب ہے ہر مسلمان پر کہ کہے صدق دل سے الیقین لایا میں اللہ پر اور اس کے سب فرشتوں پر اور کتابوں اور رسولوں پر اور قیامت کے دن پر اور جلا اٹھانے پر پیچھے مرنے کے، اور خیر و شر کی تقدیر پر کہ اللہ تعالیٰ کی بنائی ہے اور حساب ہونا اور تلنا اعمال کا قیامت میں، اور بہشت اور دوزخ سب حق ہے اور اللہ تعالیٰ ایک ہے، عدد سے نہیں ایسا مراد سے کہ اس کا کوئی سا بھی نہیں۔"

امام بخش صہبائی

دہلی میں انگریزوں نے ایک اسکول کھولا تھا جس میں ہندوستانیوں کو مغرب کے علوم سکھائے جاتے تھے۔ اس اسکول کو بعد میں ترقی دے کر کالج بنا دیا گیا۔ یہ کالج دہلی کالج اور قدیم دہلی کالج کے نام سے مشہور رہے... امام بخش صہبائی اسی کالج میں پروفیسر تھے۔ اس کالج کی خدمات بے پناہ ہیں یہاں بیشمار کتب عربی، فارسی اور سنسکرت کے تراجم اردو میں ہوئے اور اصول حکومت، فن زراعت، طب، صرف و نحو پر کتابیں تالیف کی گئیں۔ ڈاکٹر اسپرنگر بھی اس کالج کے پرنسپل تھے۔ اس کالج کے فارغ التحصیل طلبہ میں سے ماسٹر پیارے لال آشوب، مولوی ذکاء اللہ، مولوی محمد حسین آزاد، مولوی نذیر احمد، مولوی شہامت علی کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ غدر کے بعد اس کالج کا نام مٹ گیا۔ اس کالج کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی۔ یہ کشمیری دروازے میں واقع تھا جو ہنگامہ غدر کے بعد انگریزوں کے انتقام کا نشانہ بنا۔ صہبائی نے بعض بڑی ادق کتابوں کا ترجمہ اور شرح لکھی۔ انہوں نے آثار الصنادید کی تیاری میں بھی سرسید کا بہت ہاتھ بٹایا۔ انہوں نے منشی شمس الدین فقیر کی تصنیف "حدائق البلاغت" کا ترجمہ کیا۔ یہ ترجمہ ۱۸۵۵ء میں چھپا۔ صہبائی کے تعلقات شاہی قلعے میں مقیم شاہی خاندان سے بھی تھے۔ افسوس کہ غدر کے زمانے میں ان پر بھی مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ ان کے مکان کو کھود کر زمین کے برابر کر دیا گیا اور انہیں شہید کر دیا گیا۔ آزردہ نے کیا درد بھرا شعر کہا۔

کیونکہ آزردہ نکل جائے نہ سودائی ہو
قتل اس طرح سے بے جرم جو صہبائی ہو

"حدائق البلاغت" کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

"صفت تلمیح۔ یہ اس طرح پر ہے کہ کلام مشعر ہو کسی واقعہ مشہورہ پر یا ایسی چیز پر اشارہ کیا جائے کہ کتب مستعملہ میں مذکور ہے جیسے شعر سودا کا ہے

دکھلائیے جا کر تو مجھے مصر کا بازار
پر واں کو خواہاں نہیں اس جنس گراں کا

اس شعر میں اشارہ ہے طرف قصہ حضرت یوسفؑ کے وہ مشہور ہے اور یہ شعر فقیر محمد گویا کا ہے

منہ دکھانا تو کہاں وہ باتیں بھی اس کی مجھ تک
لن ترانی کی بھی آئی نہ صدا میرے بعد

اس شعر میں حضرت موسیٰؑ کے قصے کی طرف اشارہ ہے۔ حق یہ ہے کہ جو لوگ دیانت انصاف اور مذاق شعر سے بہرہ رکھتے ہیں ان کے نزدیک یہ شعر جواب نہیں رکھتا۔"

منشی عبدالکریم

منشی عبدالکریم لکھنؤ کے رہنے والے تھے تعلیم حاصل کرنے کے بعد کلکتے آ گئے۔ یہاں گورنر جنرل کے دفتر میں فارسی کے میر منشی کی حیثیت سے تعینات ہو گئے۔ یہاں انہوں نے (بعد از حصول پنشن) الف لیلہ کے انگریزی ترجمے سے اردو ترجمہ مرتب کیا (۱۸۴۲ء)۔ دیباچے میں لکھتے ہیں۔

"وہ کتاب سوا دو سو رات کی کہ جس کو شیخ احمد عرب یمنی شروانی نے واسطے پڑھانے صاحبان عالی شان کالج کلکتہ کے بہ کمال تلاش عرب سے منگوا کر چھپوایا تھا میسر نہ آئی۔ آخر کار جب راقم بہ سبب شدت امراض کے بعد تقرر پنشن بیت السلطنت لکھنؤ کو مولد اپنا ہے خانہ نشین ہوا وہ نسخہ تمام و کمال انگریزی زبان میں مع تصویرات ہم پہنچا

راقم نے اس کو اول سے آخر تک بسبب استعداد سمجھنے انگریزی کے دیکھا۔ از بسکہ قصے دلچسپ تھے۔ دو برس تک اس کا ترجمہ کرتا رہا۔ اور ۱۲۵۸ ہجری میں تمام کیا۔ شہر میں شہرہ ہوا۔ اکثر لوگوں نے منگوا کر نقل اس کی کر لی۔ کم تر مسودہ راقم کے گھر رہا۔ دست بدست پھرا کیا۔ چنانچہ پانچ سات جز تلف ہوئے۔ راقم کو اس کے لکھنے میں دوبارہ تکلیف کرنا پڑی اور طلبہ کرنے احباب سے نہایت تنگ آیا جس کو نہ دیتا وہ خفا ہوتا اور دینے میں کتاب ہاتھ سے دھوتا۔ آخر کو خیال ہوا کہ یہ کتاب چھپ جائے تا سب کے ہاتھ آئے اور راقم بھی ایک ایک نسخہ اس کے عزیزوں اور دوستوں کو بانٹے۔ فقط اسی واسطے راقم نے جس طرح ہو سکا بیچ عہد معدلت مہد پادشاہ جم جاہ خاقان زماں ابوالمظفر مصلح الدین محمد امجد علی شاہ بادشاہ غازی ملک اودھ خلد اللہ ملکہ اور وزارت وزیر اعظم کے چھپوایا اور سنہ ہجری طبع اس کتاب کے ۱۲۶۳ھ اور عیسوی ۱۸۴۷ء ہے۔"

ماسٹر رام چندر

امام بخش صہبائی کے ساتھ ماسٹر رام چندر بھی دہلی کالج میں لیکچرر تھے۔ اس اعتبار سے مولوی ذکاء اللہ، محمد حسین آزاد اور مولوی نذیر احمد ان کے شاگردانِ رشید میں سے تھے۔ ماسٹر رام چندر پہلے ہندو تھے۔ بعد میں انہوں نے عیسائی مذہب اختیار کر لیا۔ چنانچہ گارسان دتاسی دسمبر ۱۸۵۲ء کے خطبے میں رام چندر کے بارے میں لکھتا ہے کہ "ان کے عیسائی مذہب قبول کرنے پر اس سال کے ماہ جولائی میں خاصی ہل چل مچ گئی تھی!"

انگریزی فارسی اور سنسکرت پر رام چندر کو بڑا عبور حاصل تھا۔ لیکن ان کا زیادہ کمال علم ریاضی میں ظاہر ہوا۔ الجبرا اور حساب کی کئی کتابوں کے مصنف اور مترجم ہیں علاوہ ازیں ماسٹر رام چندر نے عجائب روزگار تصنیف کی جو دہلی میں ۱۸۴۷ء میں چھپی۔ ایک کتاب علم ہیئت کے اصولوں پر بھی لکھی۔ ایک کتاب تذکرۃ الکاملین کے نام سے مرتب کی جو ۱۸۴۹ء میں چھپی۔ اس کتاب میں یونان، یورپ، ہندوستان اور ایران کے مشاہیر علم و ادب کے تذکرے ہیں۔

نمونہ ملاحظہ۔

"مہندس بھاسکر کا ذکر۔ یہ شخص بڑا عقلمند اور مہندس ہند میں گزرا ہے اس کے برابر ذہین اور عاقل اور سچے علم کی پیروی کرنے والا کوئی اور شخص قوم میں نہیں ہوا ہے۔ یہ بزرگ بمقام شہر بنارس میں بیچ ۱۱۵۰ء پیدا ہوا تھا۔ اس شخص نے ہمارے شاستر کی غلطیوں کو درست کیا۔ لیکن اکثر برہمن اس کے قول پر عمل نہیں کرتے۔ اگرچہ اس کو اپنا بزرگ سمجھتے ہیں کسی شاستر میں لکھا ہے کہ زمین مثل دائرے کے ہے اور کہیں یہ لکھا ہے کہ وہ مثل مثلث کے ہے۔ بھاسکر نے ان لغو باتوں کو رد کیا اور لکھا کہ زمین کی شکل گول ہے۔ یہاں سے اس زمین کو دیکھنا چاہیے۔ شاستر میں لکھا ہے کہ زمین سانپ کے پھن اور کچھوے اور آٹھ ہاتھیوں پر سہارا پائے ہوئے ہے۔ بھاسکر نے کہا کہ اگرچہ یہ شاستر میں لکھا ہے لیکن محض غلط ہے اس نے کہا کہ زمین ہوا میں ہمارے معبود حقیقی کے ہاتھ میں معلق ہے!"

آغا امانت لکھنوی

نام سید آغا حسن، امانت تخلص کرتے تھے۔ ۱۸۱۶ء میں پیدا ہوئے شاعری میں ابتدا مرثیہ گوئی سے کی۔ مرثیہ میں مرزا دلگیر سے تلمذ اختیار کیا۔ مرثیہ گوئی چھوڑ کر غزل لکھنی شروع کر دی۔ ابھی عنفوان شباب ہی تھے کہ زبان بند ہو گئی اور دس برس تک گونگے رہے۔ زبان کا کام تحریر سے لیتے۔ اسی حالت میں کربلا شریف گئے اور وہاں ان کی زبان کھل گئی۔ امانت کا منظوم ڈراما "اندر سبھا" ان کا مشہور ترین کارنامہ ہے۔ امانت کا انتقال ۱۸۵۸ء میں ہوا۔ امانت نے اندر سبھا کی شرح میں سبب تصنیف کتاب یوں لکھا ہے۔

"ایک روز کا ذکر ہے کہ حاجی مرزا عابد علی یگانہ ازلی رفیق شفیق مونس و ہمدم خواہ قدیمی جان نثار، شاگرد اول موزوں طبیعت، تخلص عبادت عاشق کلام امانت انہوں نے از راہ محبت کہا کہ بے کار بیٹھے بیٹھے گھبرانا عبث ایسا کوئی جلسہ بے طور پر طبع زاد نظم کیا چاہیے کہ دو چار گھڑی دل لگی کی صورت ہووے اور خلق میں شہرت ہووے۔ آخر ان کی فرمائش سے بندہ اس کے کہنے پر آمادہ ہوا۔ دم بدم شوق زیادہ ہوا۔ چونکہ یہ جلسہ (ناٹک) کہنا سب کو مرغوب تھا۔ مگر اپنے نزدیک معیوب تھا۔ اس لحاظ سے اپنا تخلص بدل کر اس میں استاد تخلص کیا۔ لیکن لوگوں نے غزلوں کے سبب سے بندے کا کلام دریافت کر لیا۔ بغرض چودھویں تاریخ شوال کی ۱۲۶۸ ہجری میں اندر سبھا اس جلسے (ناٹک) کا نام رکھ کر بجائے چار باب، چار پریاں قرار دے کر شروع کیا۔ شہرت گھر گھر ہوئی۔ اہل محلہ کو خبر ہوئی۔ دو شخص اس جلسے (ناٹک) کی تیاری پر آمادہ ہوئے۔ ہجوم حد سے زیادہ ہوئے۔ رفتہ رفتہ بعد ہزاراں ہزار شور و فساد اور حجت و تکرار کے ڈیڑھ برس میں جلسہ (ناٹک) تیار ہوا مگر اپنے نزدیک بیکار ہوا کہ کس ریاضت سے درخت لگایا۔ آخر کو اس سے رنج کا پھل پایا۔ خیر ہوا سو بہتر ہوا۔"

اب تک آپ کی خدمت میں ان نثر نگاروں کی نگارشات، ان کے حالات زندگی، ان کے عہد کے معاشی حالات پیش کیے گئے جنہوں نے فورٹ ولیم کالج سے باہر رہ کر اردو نثر کی گراں بہا خدمات انجام دیں۔ اس کے بعد یعنی اگلی قسط سے ہم غدر کے دوران اور غدر کے بعد کے اولین نثر نگاروں کی تخلیقات پیش کریں گے۔

روشن کتابوں کا ایک روشن سلسلہ
مُسلم شخصیات کا
اِنسائیکلوپیڈیا
(تاریخِ اسلام کے آئینے میں)
اِس سلسلے کی چھ اقساط چھپ چکی ہیں ——
آج ہی اپنے قریبی بُک سٹال/ہاکر سے طلب فرمائیں!
قیمت ہر قسط -/۳ روپے
مطبوعات شیخ غلام علی
ادبی مارکیٹ، چوک انارکلی، لاہور